آوازیں

مصنف

اسرار اکبرآبادی بی۔اے

سنہ ۱۹۶۱ء

فردوس پبلشنگ ہاؤس سہنگ منڈی۔ آگرہ

باراول	اپریل سنہ ۱۹۶۱ء
تعداد	ایک ہزار
قیمت	ایک روپیہ پچاس نئے پیسے

ناشر

فردوس پبلشنگ ہاؤس

پروپرائٹر

محمد صابر شمسی

ہینگ کی منڈی آگرہ

آوازیں

نمبر شمار	افسانہ	صفحہ
۱	ہم سب ایک ہیں	۹
۲	انسان جاگ اُٹھا	۱۸
۳	نئے راون	۳۲
۴	انتظار (ڈرامہ)	۴۰
۵	بلیدان	۵۰
۶	معجزۂ فن	۵۸
۷	بھیانک اندھیرا	۶۶
۸	پاپی	۷۲
۹	شاہکار	۸۲
۱۰	منّا	۹۴
۱۱	انارکلی (ڈرامہ)	۱۱۴
۱۲	راکھ	۱۲۳
۱۳	سُنہری کلیاں	۱۳۱
۱۴	اُمّید	۱۳۶

پروپرائٹر	محمد صابر شمسی
کاتب	منشی افتخار احمد خاں
آرٹسٹس	آفریدی اور مصطفےٰ خاں
مطبوعہ	آگرہ اخبار برقی پریس آگرہ

فردوس پبلشنگ ہاؤس

ہینگ کی منڈی

آگرہ

پاکستانی حضرات ذیل کے پتہ پر قیمت روانہ کرکے رسید ہندوستان کے پتے پر ارسال کردیں۔ انہیں کتاب ارسال کردی جائے گی۔

پبلشر

پاکستان کا پتہ

جناب سید شوکت علی صاحب شاہ عالمی گیٹ۔ کوچہ کرپارام مکان نمبر D ۲۹۲۶ لاہور

ہندوستان کا پتہ

فردوس پبلشنگ ہاؤس۔ ہینگ کی منڈی۔ نیو تاج ٹاکیز آگرہ۔ یو، پی

سینٹ جانس کالج

اور

احمدیہ حنفیہ ہائی اسکول آگرہ

کے نام

جہاں میں نے تعلیم پائی اور جن سے مجھے عشق ہے

اسرار

آواز

اسوقت میرے افسانوں کا مجموعہ "آواز میں" آپکے ہاتھ میں ہے۔ ممکن ہے ابتک آپ مجھے شاعر کی حیثیت سے جانتے ہوں، کیونکہ میری غزلیں اور نظمیں بہ نسبت افسانوں کے زیادہ رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ مجھے بالکل ہی نہ جانتے ہوں لیکن میں یہ عرض کر دوں کہ میں پہلے افسانہ نگار ہوں اور بعد میں شاعر۔

میرا افسانہ "ہم سب ایک ہیں" پرواز رنگون (برما)، اور رہنمائے تعلیم دہلی میں جس شکل میں شائع ہوا تھا۔ اب میں نے اُسے تبدیل کر دیا ہے اور ایک پلاٹ بڑھا دیا ہے۔

کچھ ہی دن ہوئے، میں نے اپنے ایک دوست کے سماجی ناول کے پیشِ لفظ میں لکھا تھا کہ موجودہ دَور کا فنکار سترھویں اور اٹھارویں صدی کے رشنلزم، انیسویں صدی کے سائنٹفک میٹریلزم DARWINIANISM اور بیسویں صدی کے مارکسزم اور فرائیڈیزم سے متاثر ہوا ہے۔ یہاں اس سے کوئی بحث نہیں کہ تمام فنکار ان تحریکوں کو درست سمجھتے ہیں یا نہیں۔ اس کے متعلق میں صرف اتنا کہونگا کہ نہ تو تمام فنکار ان تحریکوں کو غلط سمجھتے ہیں اور نہ تمام فنکار ان کو صحیح۔ میں بھی ان تحریکوں سے شعوری اور غیر شعوری طور پر متاثر ہوا ہوں اور میرے ذہن نے بھی ان کے کچھ اثرات قبول کئے ہیں لیکن میرے نزدیک جو باتیں غلط ہیں انہیں میں ابتک غلط سمجھتا ہوں اور جو میرے نزدیک صحیح ہیں۔ انہیں صحیح۔ اسکا ثبوت آپ کو میرے ان افسانوں میں ملجائے گا۔ جو میری ابتدائی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

اسرار
۳۴/۱۶ - منٹولہ - آگرہ

۲۵ مارچ سنہ ۱۹۶۱ء

طبقات کی دیوار کو سب مِل کے گرا دو

انسان کو انسان کی میراث دِلا دو

فرسودہ روایات کی ظلمت میں نہ بھٹکو

ہر گام پہ اخلاق کی قندیل جلا دو

اسرار

ہم سب ایک ہیں

"ایک دن مجھے آپ کو اور آپ کو مجھے بھلانا ہی پڑے گا۔ ہمارے وہ وعدے ختم ہو جائیں گے جو ہم نے مستقبل سے بے نیاز ہو کر کئے تھے۔ یہ چوری چوری ملاقاتیں ایک خیال بن جائیں گی کیونکہ سماج ہرگز اس بات پر تیار نہیں ہوگا کہ دو مختلف مذاہب کے فرد ایک دوسرے کے شریک حیات بن جائیں لیکن میں اور آپ دو الگ الگ ...."

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اور اسکی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔

"کیا تم بھی اس مکار سماج سے ڈر گئیں۔ جس نے آج اپنے غلط رسم و رواج سے انسان کو انسان کا دشمن بنا رکھا ہے۔ جس نے انسانیت کا خون کر دیا ہے اور دنیا کو بدامنی کا شکار بنا رکھا ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ یہ حسد انسانوں میں یوں ہی قائم رہے۔ انسانیت کا خون ہوتا رہے اور دنیا بدامنی کے شعلوں میں جھلستی رہے۔"

سُدھیر نے اُس پر سوالوں کی بوچھار کردی۔ اُس نے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اُٹھائیں اور سُدھیر کے غمگین مگر جذبات سے دمکتے چہرہ کو دیکھا اور ایک لمحہ کے بعد اسکی آنکھیں پھر زمین پر گڑ گئیں اور اُس نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔

"نہیں ـــــ مگر کیا ہماری اس بغاوت سے سماج سدھر جائے گا؟"

"ہاں ـــــ جب ہم دو مختلف مذاہب کے فرد ایک دوسرے کے ہو جائیں گے تو ہماری جیسی وہ سینکڑوں آوازیں بھی بلند ہو جائیں گی۔ جو سماج کے ڈر سے دلوں میں گھُٹ رہی ہیں تب مذاہب کی یہ مضبوط دیواریں منہدم ہو جائیں گی۔ جنہوں نے آج انسانوں کے درمیان غیریت، جلن۔ حسد اور کینہ پیدا کر دیا ہے۔ آشا دنیا کے کُل انسان کسی ایک ہی انسان کی اولاد ہیں۔ جنمیں پُشت در پُشت اضافہ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ یہ بات نامناسب ہے کہ جب دنیا وجود میں آئی ہوگی تو ہندوستان میں ایک ہندو پیدا ہوا ہو، عرب میں ایک مسلمان اور فلسطین میں ایک عیسائی۔ جنکی اولادیں ابتدا ہی سے ہندو مسلم اور عیسائی وغیرہ چلی آتی ہیں بلکہ مذاہب ہمارے آبا و اجداد کی بنائی ہوئی راہیں ہیں جنھوں نے محض اس نظریہ سے بنائی تھیں کہ ان کی اگلی نسلیں انسانیت کے راستہ پر گامزن رہیں نہ کہ آپس میں بیر پیدا کریں جیسا کہ آج دیکھا جاتا ہے۔ تمام مذہبوں کا مقصد ایک ہے اور ان کے کام بھی ملتے جلتے ہیں۔ جیسے اگر کوئی ہندو مندر میں دیا جلاتا ہے تو مسلمان مسجدوں میں چراغ روشن کرتے ہیں۔ ہندو تیرتھ جاتے ہیں تو مسلمان حج

کرتے ہیں۔ ہندو مندروں کی پرکرما کرتے ہیں تو مسلمان کعبہ کا طواف کرتے ہیں۔ ہندو مورتی کے سامنے سر جھکاتے ہیں تو مسلمان سنگِ اسود کو بوسہ دیتے ہیں اگر یہ گنگا جل لاتے ہیں تو وہ آبِ زمزم لاتے ہیں۔ ہندو گنا گت میں شرادھ کرتے ہیں تو مسلمان ماہِ محرم میں تعزیہ داری اور نیاز دلواتے ہیں۔ اگر یہ رامچندر اور کرشن کے دلدادہ ہیں تو وہ حضرت علی کرم اللہ حسینؓ پر فدا ہیں۔ اب تم ہی سوچو، پھر ایک باپ کی اولاد ہیں۔ یہ نا اتفاقی کیوں؟ —— تم سماج سے ڈر کر حقیقت کا گلا گھونٹ دینا چاہتی ہو۔ میری ہمتوں اور حوصلوں کو سماج کا گھناؤ ظالم گروہ دکھا کر پست کر دینا چاہتی ہو —— آشا ہم سب ایک ہیں —— اس مکار سماج نے ہی آپس میں نفرت کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ اسی نے معصوم دلوں میں یہ بات بٹھائی کہ یہ ہندو ہے، یہ مسلمان ہے، وہ سکھ ہے اور وہ عیسائی ہے۔ ان سے نفرت کرو۔ الگ رہو۔ اور ان کے ساتھ نہ کھیلو۔ مجھے ان لغوتوں کی جڑیں اکھاڑنی ہیں۔ آپس کی جلن اور حسد کی دھجیاں اڑانی ہیں اور ان کے دلوں میں یہی بٹھانا ہے کہ ہم سب دنیا والے ایک ہیں اور ایک ہی باپ کی اولاد ہیں —— لیکن تم تو سماج سے ڈرتی ہو بدنامی سے خائف ہو۔ اور مجھے بھی حقیقت کے راستے سے اتارنا چاہتی ہو۔ آخر کیوں؟"

منوہر نے جذبات پر قابو پاتے ہوئے اسے دیکھا اور اپنے سوال کا جواب طلب کیا آشا کے آنسو تھم چکے تھے لیکن غمگین اور بوجھل بوجھل سا چہرہ اب تک اترا

ہوا تھا جیسے وہ غور و فکر کے ساگر میں گم ہو۔ رات برابر بھیگتی جا رہی تھی کچھ لمحات کے بعد اُس نے خاموشی کو توڑا اور جواب دیا۔

"ہماری آواز دھیمی اور قوت کم ہے"

"ہاں —— مگر تیز ہوا اور آندھیاں بڑے بڑے مضبوط درختوں کو اکھاڑ کر پھینک دیتی ہیں۔ لیکن گھاس کے وہ کومل اور نرم نرم پودے مختلف اداؤں سے جھک جھک کر اُن تند ہواؤں کے تھپیڑوں کو سہتے ہیں جو ساگر میں ایک بھیانک اور پُرجوش طوفان اُٹھاتے ہیں" سدھیر نے کہا۔

"لیکن اُکھڑ جانے کے بعد اُن کا میلوں پتہ نہیں لگتا۔ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں" آشا آہستہ سے بولی۔

"لیکن وہ تنکے بھی کسی طائر کا نشیمن بنتے ہیں۔ اسی طرح اگر سماج کی تیز آندھی نے ہمیں اُکھاڑ کر پھینک دیا تو ہم اگلی نسلوں کے لئے راستی کا مارگ بنیں گے۔

"سدھیر ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔ کہ ہم شادی کیسے کر لیں اگر ہم سماج کے مخالف ہو گئے تو تمہیں دولہا کون بنائے گا؟ کون تمہاری بارات کے ساتھ میرے گھر آئے گا؟ اور کون میرا سنگھار کرے گا؟ کون میرے ہاتھوں میں مہندی اور مانگ میں سیندور بھرے گا؟ اور کون مجھے تمہارے ساتھ وداع کریگا؟" یہ کہتے کہتے آشا کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور وہ خاموش ہو گئی۔

"ہم سماج سے بغاوت کر رہے ہیں آشا۔ اس لئے ہمیں اپنی خوشیوں اور ایک حقیقت

کے لئے ان کے سہارے کی کوئی ضرورت نہیں ـــــ ہم اس کے گھر جائیں گے جو ہم سب کا مالک ہے اور وہاں ایک دوسرے کے ہو جائیں گے دیکھو وہ ہمارے اس ملن پر خوش ہوگا وہی ہمارے سروں پہ ہاتھ پھیرے گا۔ وہی تمہیں میرے ساتھ رخصت کرے گا۔ اور وہی ہمارے اوپر پھول نچھاور کریگا" یہ کہہ کر سدھیر خاموش ہو گیا۔ آشا بھی چپ بیٹھی تھی۔

"تو کل اسی مندر پہ ملیں گے۔ سدھیر نے کچھ دیر بعد خاموشی کو توڑا" جہاں شو راتری کی رات پہلی ملاقات ہوئی تھی تمہیں میرا نام سنکر کتنا تعجب ہوا تھا۔ تمہیں یقین نہیں آیا تھا لیکن میرے ان جملوں نے تمہارے اُس طلسم کو توڑا کہ ہم سب ایک ہیں۔ اور ایک ہی باپ کی اولاد ہیں ـــــ مذاہب تو صرف انسانیت کی شاہراہ ہیں ان سب کا مقصد ایک ہی ہے۔ پھر اکثر ملاقاتیں اُسی مندر میں ہوتی تھیں اور بعض اوقات ہم دونوں بڑی مسجد بھی جاتے تھے۔ وہاں بھی چلیں گے" یہ کہکر سدھیر گھاس سے اُٹھ گیا اور آکاش کو دیکھنے لگا جہاں ماہ و انجم پورے آب و تاب سے جگمگا رہے تھے۔ آشا اب تک سر جھکائے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔

"چلئے نا" ـــــ سدھیر کی آواز نے اُسے اُٹھنے پر مجبور کر دیا اُس نے سامنے پارک کے اونچے اونچے درختوں کی قطاروں کو دیکھا ـــ ان کے پیچھے مندر کا اونچا مینار اور بڑی مسجد کا گول گنبد چاندنی میں چمک رہے تھے۔ وہ کچھ ٹھٹکی لیکن پھر سنبھل کر سدھیر کے پیچھے پیچھے روش پر چلنے لگی۔

اگلا دن ہوا۔ سُدھیر دھوتی کُرتہ اور صدری پہنے مندر کی لمبی لمبی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ اُس کے سیاہ بال چوڑے ماتھے پر ڈھلک آئے تھے۔ وہ آج بہت خوش تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ سماج کو بھید بھاؤ اور حسد وجلن کے شعلوں سے بچا رہا ہے اور امن کا پرچم بلند کر رہا ہے۔

وہ شیو کی مورتی کو عبور کرتا کرشن کی مورتی کے سامنے آیا اور ایک انداز سے اُن کی مُرلی اور بشاش چہرہ کو دیکھا پھر اُسکی نظر کرشن کے بل کھائے شریر سے پھسلتی پیروں میں آئی وہ فوراً آگے بڑھا اور پھولوں کے درمیان سے ایک پرچہ کھینچا اور کھول کر پڑھنے لگا۔

"سُدھیر ——

میں سماج سے بغاوت نہیں کر سکتی۔ مجھے اپنے بڑوں کا کہنا ماننا ہے۔ اسی میں میری بھلائی ہے۔ مجھے معاف کرنا۔ اور ہمیشہ کے لئے بھول جانا۔

"آشا"

"بزدل" —— سُدھیر کے منہ سے بے اختیار نکلا اور پرچہ اس کی گرفت میں گھُٹ گیا۔ اُس نے کرشن کی مورتی کو دیکھا اور بڑبڑایا۔

"یہی ہیں نا تمہارے بڑے —— اُنھوں نے کب اور کہاں کہا ہے۔ کہ مسلمانوں سے نفرت کرو۔ عیسائی سے دُور رہو اور پارسیوں سے پرہیز کرو۔ کوئی مذہب آپسمیں بیر رکھنا نہیں سکھاتا۔ تم نے اس مکار سماج کو اپنا بڑا مان رکھا ہے سُنے

آشا کے سماج! آنکھیں کھول اور دیکھ، تیرے غلط رسم و رواج سے دُنیا بدامنی کی آگ میں جھلس رہی ہے۔ تو نے ہی آپس کی دشمنی، حسد و جلن، لالچ اور بھید بھاؤ کو جنم دیا ہے، تو نے ہی ایک باپ کی اولاد میں پھوٹ ڈلوائی ہے۔ جن کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ تیرے بسائے ہوئے ملک تباہ ہو رہے ہیں، تیرے بھائی غلیظ کیڑوں کی طرح جان گنوا رہے ہیں، تیری نوعمر بہنیں بیوہ ہو رہی ہیں۔ تیرے بچے یتیم ہو رہے ہیں تیرے ہاتھوں کے لگائے چمن خوفناک دشت بن رہے ہیں اگر تو نہیں سنبھلا تو ملک تباہ ہوتے رہیں گے تیرے بھائی مرتے رہیں گے تیری نوعمر بہنیں بیوہ ہوتی رہیں گی تیرے بچے یتیم ہوتے رہیں گے۔ یہ تاج محل فنا ہو جائے گا اور خوبصورت شہر ایک ویرانہ بن جائیں گے ——— تو کیوں نہیں سمجھتا کہ ہم سب ایک ہیں اور ایک ہی باپ کی اولاد ہیں ——— کیا تو چاہتا ہے کہ یہ تباہی و بربادی یوں ہی قائم رہے؟"

شدھیر خاموش ہو گیا۔ اُس کو سانس تیز تیز آ رہا تھا جیسے وہ بہت دُور سے پیڈل سوٹر کر آیا ہے اور اپنی ریس میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس کے سرخ سرخ چہرے پہ ہلکی ہلکی پیلاہٹ دوڑ گئی اور اُس کے آنسو نکل آئے۔ کچھ دیر کے بعد وہ گلوگیر آواز میں پھر بڑبڑایا۔

"آج تیرے ہی خوف سے میرا ہمت افزا ساتھی چھوٹ گیا۔ تو نے میری ہمتوں اور حوصلوں کو پست کر دیا اور میری حق آواز کو بھینچ دیا۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور غمگین و اُداس چہرہ جھکائے مندر سے نکل گیا۔

وہ ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا تھا۔
نیچے ندی بہہ رہی تھی۔

اب وہ اس متعصب دنیا میں رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس دنیا میں جہاں انسان انسان کا دشمن ہے۔ جہاں بھائی بھائی کا دشمن ہے۔ جہاں امن نہیں۔ اخوت و مساوات نہیں۔ انسانیت نہیں۔ جہاں خدا بٹ گیا ہے۔ انسان بٹ گئے ہیں ـــــ اُسے اس دنیا سے نفرت ہو گئی تھی۔ اور اب وہ خودکشی کر رہا تھا اُسکی آنکھیں بے اختیار بند ہو گئیں۔ اور اشک کے دو قطرے پلکوں سے چھن کر اُسکے گرم رخساروں پر آ گئے۔ اور وہ ندی میں گرنے کے لئے آگے بڑھا۔ لیکن فوراً کسی نے اپنی باہوں میں تھام لیا۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں اور پیچھے مُڑ کر دیکھا ـــــ آشا کھڑی تھی ـــــ وہ بے اختیار اس سے لپٹ گیا اور رونے لگا۔ وہ بھی رونے لگی۔ دریا رونے لگا۔ کھیت رونے لگے۔ زمین رونے لگی آسمان رونے لگا۔
"مجھے معلوم نہ تھا کہ تم ایسا کرو گے" ـــــ آشا نے اُداس لہجہ میں کہا ـــــ "مجھے معاف کر دو سُدھیر۔ اب مجھے بھی اس مکار سماج سے نفرت ہو گئی ہے۔ چلو ہم کہیں چلکر ایک ایسا سماج بنائیں۔ جہاں تم خودکشی کے لئے آمادہ نہ ہو"
یہ سُنکر سُدھیر نے آشا کو اور کھینچ لیا ـــــ اس کے آنسو اب بھی نکل رہے تھے لیکن آنکھیں ہنس رہی تھیں۔ ہونٹ ہنس رہے تھے۔ دل ہنس

رہا تھا۔ کھیت ہنس رہے تھے۔ ندی ہنس رہی تھی۔ نیلا آکاش ہنس رہا تھا۔

اور وہ ہنستے ہوئے ٹیلے پر سے اتر آئے اور ایک نیا سماج بنانے کے لئے جنگلوں کی طرف نکل گئے۔
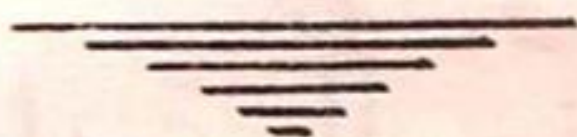
اِنسان جاگ اُٹھا

آج طلبا کا آخری پیپر تھا۔

وہ امتحان کے اس بار سے سبکدوش ہو رہے تھے جس نے ان کے لبوں کی ہنسی چھین لی تھی۔ کالج کی فضا میں اب فلک شگاف قہقہے نہیں بکھرتے۔ ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کی بارش نہیں ہوتی۔ کالج کا وہ ہرا بھرا لان خاموش تھا۔ جہاں اکثر لڑکے اور لڑکیاں گلگشت کرتے تھے۔ فضا میں رنگ برنگی کلیاں چٹکتی اور مرجھا جاتی تھیں۔ لیکن انھیں کوئی نہیں دیکھتا تھا...... آج پھر وہی فلک شگاف قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ لڑکیوں کے ہلکے ہلکے شبنمی تبسم فضا میں بکھر رہے تھے۔ کیونکہ آج آخری پرچہ تھا اور گرمیوں کی طویل چھٹیوں کا آغاز۔

گھنٹہ بجنے لگا۔ طالب علم کمروں میں آ گئے اور اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ شنکر بھی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں نیلی دوات اور اسکیل تھا اور دوسرے میں کاپی۔ اسکا چہرہ کچھ اداس تھا۔ جیسے اُسے امتحان ختم ہونے اور کالج بند ہونے

کی کوئی خوشی نہیں لیکن جوں ہی اُس نے سامنے سیٹ پر رادھا کو مُسکراتے دیکھا تو اس کے لبوں پر بھی تبسم جاگ اُٹھا اس کا غمگین چہرہ دمکنے لگا۔ جیسے کوئی تفکرات میں ڈوبا شخص اُمنڈتے بادلوں اور ٹھنڈی ہواؤں کی سُبک خرامی سے متاثر ہو کر اپنے غموں کو بھول جاتا ہے۔ رادھا کے رُخسار بھی شنکر کو دیکھکر سُرخ ہو گئے .... وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور کمرے کے طلباء انھیں دیکھتے رہے۔ کچھ مُسکرا رہے تھے اور کچھ حسد کی آگ میں جل رہے تھے۔ لیکن مہیش سے یہ منظر برداشت نہ ہو سکا اور وہ رقابت کے جذبہ سے متاثر ہو کر اپنی سیٹ سے اُٹھا اور شنکر کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"یار پیپر شروع ہونے والا ہے اور تم ابھی یہاں کھڑے ہو۔ جاؤ اپنی سیٹ پر بیٹھو۔"

شنکر چونک گیا۔ وہ مہیش کو دیکھکر مسکرانے لگا۔ اور اپنی کُرسی پر جا بیٹھا۔

گھنٹی کی آواز بند ہو چکی تھی۔ طلباء کو پرچے تقسیم کر دیئے گئے تھے اور اب اُن کے سر کاپیوں پر جھکے ہوئے تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی ــــ گورستان کا سا بھیانک سکوت۔

شنکر ایک سیلف سپورٹ اسٹوڈنیٹ تھا۔ والد کی آمدنی اتنی نہیں تھی کہ وہ گھریلو اخراجات کے ساتھ شنکر کی پڑھائی کا بار بھی اُٹھا سکیں۔ کالج کے بعد وہ ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت کرتا تھا۔ وہ پارٹ ٹائم کلرک تھا۔ دس بجے رات تک لیجر میں اُلجھا رہتا تھا اور اسکا معاوضہ اُسے ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو تنخواہ کی شکل میں ملتا تھا۔

جس سے وہ اپنے اور کالج کے اخراجات پورے کرتا۔ وہ سادہ رہتا کیونکہ اس کے پاس قیمتی سوٹ اور کروکوڈائل لیدر کے شو نہیں تھے اس کے بال ہمیشہ خوشبودار تیل سے محروم رہتے۔ اس کے پاس قیمتی پین اور گھڑی بھی نہیں تھی —— لیکن اس کے باوجود وہ مطمئن نظر آتا تھا۔ کیونکہ وہ سیلف سپورٹر تھا۔ اپنے اور اپنی تعلیم کے اخراجات کا خود کفیل۔ اس احساس نے اس میں خود اعتمادی اور برتری کا جذبہ پیدا کر دیا تھا —— وہ ایک مفلس طالب علم تھا لیکن —— خوددار۔ اس کے بشرہ پر عام طور پر ایک مسرت آمیز اطمینان برستا تھا۔ تاہم کبھی کبھی اسکا مطمئن چہرہ مغموم بھی نظر آتا —— ایک گہری خاموشی۔ ایک طویل سکوت۔ شیو بڑھا ہوا۔ اسکی زندگی میں ایسے منحوس لمحات بھی آتے جب اسکی جیب میں زہر کھانے کے لئے ایک آنہ بھی نہ ہوتا۔ اس لئے وہ ریزر نہیں خرید سکتا تھا۔ ان تمام حالات سے متاثر ہو کر اس جذبات امنڈآتے اور اس کے ذہن میں شاعری کا سوتا پھوٹ پڑتا تھا۔

رادھا شنکر سے محبت کرتی تھی۔ وہ ایک سرمائے دار کی خوبصورت لڑکی تھی اس کا چہرہ گلاب کی طرح سرخ تھا۔ چاند کی طرح گول۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ لال تھے اُن کے قریب ایک کالا اور گول تِل بھی تھا۔ آنکھوں میں تاروں کی سی چمک تھی اور بدن گداز تھا۔ وہ رقص میں ماہر تھی۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود وہ شنکر سے محبت کرتی تھی .... شنکر جو ایک غریب طالب علم تھا۔ اور ایک شاعر بھی۔

وہ دونوں فن کار تھے اور ایک دوسرے کے فن کا احترام کرتے تھے۔ دونوں کے سینہ میں ایک کلاکار کا پاک دل دھڑکتا تھا ـــــ دونوں کی نظریں کلاس میں ملتیں۔ کچھ کہتیں اور جھک جاتی تھیں وہ روز شام کو ملتے۔ جب آفتاب غروب کے لال ساگر میں ڈوب رہا ہوتا۔ دونوں ایک لمبی اور خاموش سڑک کے بیچ ٹہلتے اور پھر اس سڑک کے پاس کھڑے ایک مٹی کے ٹیلے پر چڑھ جاتے اور وہاں ہری گھاس پر بیٹھکر تصورات کی رنگین اور خوبصورت دنیا میں کھو جاتے اور جب سورج غروب ہو جاتا۔ شنکر تصورات سے باہر آتا اور رادھا کے ساتھ یہ کہتا ہوا نیچے اترتا۔

"رادھا آج دیر ہوگئی۔ مجھے ڈیوٹی پر جانا ہے۔ کہیں بوس الگ نہ کر دے۔"

رادھا اس کے پیچھے اترتی اور پھر دونوں اندھیرے میں گم ہو جاتے تھے۔

اس ہرے بھرے ٹیلے پر وہ روزانہ ملتے تھے کبھی شنکر رادہا کو اپنی غزل سناتا اور کبھی رادہا اس کے سامنے اپنا رقص پیش کرتی اور اسکی پائل کی جھنکار فضا میں ایک نشہ گھول کر آہستہ آہستہ دم توڑ دیتی تھی۔ کبھی رادھا شنکر کے سینہ سے لگی دور دھند لکے میں کچھ دیکھنے کی کوشش کرتی اور پھر دونوں خیالات کے اتھاہ ساگر میں ڈوب جاتے تھے۔

وہ الفت کے سرسبز باغ میں اٹھکھیلیاں کرتے پھر رہے تھے کہ ہمیشہ آندھی اور طوفان بیکران کے درمیان مائل ہوا وہ خوبصورت تھا اور ایک

سرمایہ دار کا لاڈلا بیٹا۔ اس کے پاس قیمتی سوٹ تھے اور کالج آنے کے لئے نیو ماڈل کا ایک سکوٹر۔ وہ رادھا کو چاہتا تھا۔ لیکن اس کے دل میں رادھا کے فن کی قدر نہ تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک سرمایہ دار کی لڑکی ناچ کر عوام کے دل بہلائے۔ وہ رادھا پر جان دیتا تھا اس کے باوجود رادھا اس سے نفرت کرتی تھی۔...... شنکر بھی مہیش سے دُور دُور رہتا۔ کیونکہ وہ شاعروں کو پاگل دیوانہ اور شرابی سمجھتا تھا۔ اور کچھ نہیں۔ وہ سب کے سامنے شنکر کو ذلیل کر دیا کرتا تھا۔

گھنٹے کی تین آوازیں خاموش فضا میں گونج گئیں۔ پروفیسر نے حکمیہ لہجے میں کہا" اسٹاپ رائٹنگ"

طلبا کے قلم رُک گئے۔ کاپیاں بند ہو گئیں اور یک بعد دیگر پروفیسر کے ہاتھ میں آ گئیں۔ کمرے میں پھر شور و غل ہونے لگا جیسے صبح صادق سوئے ہوئے قافلے والے آگے بڑھنے کے لئے جاگ اُٹھے ہوں۔

لڑکے کمرے سے باہر نکلنے لگے۔ شنکر نے جاتے ہوئے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ رادھا اپنا پین بلاؤز میں لگا رہی تھی۔ اُسکے بال کچھ بے ترتیب ہو گئے تھے اس وقت وہ اور بھی حسین لگ رہی تھی۔ اُس کے سُرخ ہونٹوں پر نیلی سیاہی کا دھبا لگ گیا تھا۔ یہ دیکھکر شنکر کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ رادھا بھی مُسکرانے لگی اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا۔ اور شنکر ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

پرچہ کو ختم ہوئے چار گھنٹے گذر چکے تھے۔ اب آفتاب مغرب کی حدود میں تھا۔ درختوں کے لمبے لمبے سائے مشرق کی طرف گھوم گئے تھے۔ شنکر گھر سے باہر آیا اور سڑک پر چلنے لگا۔

اُس نے دُور سے اس گھنے درخت کو دیکھا جس کے ٹھنڈے سائے میں رادھا بیٹھی اسکا انتظار کر رہی تھی۔ شنکر کے قدم تیز ہو گئے۔ اسے دیکھکر رادھا کے ہونٹ بھی کھل اُٹھے اور وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی۔ دونوں ایکدوسرے کے قریب آئے اور اس ٹیلے کی طرف بڑھ گئے۔ جہاں وہ ہمیشہ بیٹھتے تھے۔

فضا میں قہقہے بکھرتی ہوئی رادھا ٹیلے پر چڑھ آئی اور ہری ہری گھاس میں گر گئی۔ وہ دوڑتے دوڑتے تھک گئی تھی۔ شنکر بھی ہنستا ہوا پیچھے پیچھے آیا۔ وہ رادھا کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا...... لیکن اب وہ گھاس پر بے سُدھ پڑی تھی۔ اُسکا سینہ اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ شنکر بھی اسکے قریب آکر بیٹھ گیا۔

"رادھا" شنکر نے کہا۔

"ہُوں" رادھا نے جواب دیا۔

"آج ہم کتنے خوش ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے غم تو نیچے دنیا میں ہی ہیں" شنکر نے نیچے اُس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جہاں شہر کے اونچے اونچے مکانات اور بلڈنگیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں"۔ اور جب انسان اس غم کی دُنیا سے اوپر آجاتا ہے تو وہ غموں کو بھول جاتا ہے شاید اسی لئے لوگ پہاڑوں

پر جاتے ہیں۔۔۔۔ کیوں رادہا۔ ٹھیک ہے نا؟" شنکر نے پوچھا

"ہاں۔ ہاں۔ شنکر بالکل ٹھیک ہے۔ ہم بھی تو کل کشمیر جا رہے ہیں۔ گرمی کی چھٹیاں گذارنے" رادہا نے بے باکانہ انداز میں کہا۔

اس کے یہ الفاظ ایک بھاری پہاڑ بن کر شنکر پر آن پڑے اُس کا شگفتہ چہرہ فوراً کُملا گیا۔ ہونٹوں پر مُردنی سی چھا گئی۔ سانس کچھ دیر کے لئے رُک سا گیا۔ وہ بُھول گیا۔ رادہا اس کے قریب بیٹھی مُسکرا رہی ہے اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے رنج وغم کا سیاہ مجسمہ اُس کے سامنے کھڑا قہقہے لگا رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔

"میں ہر جگہ موجود ہوں۔ شنکر۔ ہر جگہ۔۔۔۔۔۔ ہا ہا ہا"

شنکر کا چہرہ اور اُداس ہو گیا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھا گیا اسکی افسردہ صورت دیکھکر رادہا نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"کیا بات ہے شنکر۔۔۔ کیوں اُداس ہو گئے؟"

"اُداس"، شنکر نے جواب دیا۔ "میں اُداس کیوں ہو سکتا ہوں۔ رادہا میں تو تمہارے ساتھ اس اونچے ٹیلے پر بیٹھا ہوں۔ جہاں رنج وغم کا نام تک نہیں۔ تفکرات تو نیچے دنیا میں ہیں"

"شنکر بھگوان کے لئے رنجیدہ نہ ہو۔ میں جانتی ہوں تم میرے بغیر ایک پل نہیں ٹھہر سکتے۔ نہ معلوم تم نے ان چھٹیوں کے لئے مجھ سے کیا کیا اُمیدیں وابستہ کر رکھی تھیں اور میں تمہیں چھوڑ کر کشمیر جا رہی ہوں۔۔۔۔۔۔ لیکن نہیں۔ یہ لو"

اور شنکر کے سامنے نوٹوں کی کئی گڈیاں تھیں "تم کشمیر پہنچکر کسی ہوٹل میں ٹھہر جانا اور ہم وہاں بھی اسی طرح ملتے رہیں گے"

کچھ دیر تک شنکر نوٹوں کو گھورتا رہا۔ اور پھر بولا "مجھے اتنا ذلیل نہ سمجھو رادھا۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں، میں خود تمہارے ساتھ کشمیر جا سکتا ہوں"

شنکر نے اپنی خودداری کی لاج بچانے کے لئے اس ذلت کا گلہ جھوٹ کے ہاتھوں گھونٹ دیا اور رادھا کے کئی بار اصرار پر بھی اس نے وہ رقم لینا منظور نہیں کی۔ اس نے اپنی مجبوری ظاہر کر دی کہ اس کے پیروں میں نوکری کی بیڑیاں پڑی ہیں۔

یہ کہہ کر اس نے رادھا کو مطمئن تو کر دیا لیکن جیسے خود کوئی بڑا جرم سرزد کر دیا ہو۔ اُسے فرم سے چھٹی مل سکتی تھی۔ لیکن اُس نے جھوٹ بولا تھا حقیقت میں اس کے پاس روپے نہیں تھے ——— کیونکہ وہ مفلس تھا۔

کچھ دیر بعد وہ ٹیلے سے اُتر گئے۔

شنکر سر جھکائے بازار میں چل رہا تھا۔ وہ اداس تھا کیونکہ کل اس کی رادھا کشمیر جا رہی تھی۔ وہ چہل پہل سے قطعی متاثر نہیں ہو رہا تھا۔ اور افسردہ اس پرائیویٹ فرم کی طرف جا رہا تھا، جہاں وہ نوکر تھا۔ سکوٹر کی گڑگڑاہٹ سے چونک گیا۔ اُس نے دیکھا کہ مہیش سکوٹر پر سوار اُس کے سامنے کھڑا ہے۔

"ہیلو شنکر" مہیش نے مسکرا کر کہا۔

"ہیلو مہیش ...... اِدھر کدھر؟" شنکر نے مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے پوچھا

" یار پکچر دیکھنے آیا ہوں۔ ایک مدت ہوگئی دیکھے ہوئے ...... اور پھر آج امتحان بھی تو ختم ہوئے ہیں " مہیش ہنسنے لگا۔ شنکر بھی ہنستا رہا۔

" یار رادھا کے سردبنٹ سے معلوم ہوا ہے کہ وہ کل کشمیر جا رہی ہے اپنا بھی خیال ہے۔ وہیں چھٹیاں گذاروں۔ وہاں اس سے باتیں کرنے کا موقع مِل جائیگا" مہیش نے کہا۔

اپنے رقیب کے یہ جملے سُن کر شنکر کی آنکھیں پھیل سی گئیں اس کے سینے میں آگ کے شعلے دہک اُٹھے۔ اس کے باوجود بھی وہ ہنستا رہا۔ سینے میں ایک بھیانک طوفان چھپائے۔

" مجھے معلوم نہیں،" شنکر نے جواب دیا۔

" یار۔ وہ ضرور جا رہی ہے۔ یقین کرو۔ میں بھی ضرور جا رہا ہوں ...... اچھا۔ گڈ نائٹ " اور مہیش کا سکوٹر بھیڑ میں غائب ہوگیا۔ وہ شنکر کے دہکتے شعلوں پر پٹرول چھڑک گیا تھا ...... اور نا معلوم کیوں، اب وہ بھی اُڑ کر کشمیر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اسکی سوئی آرزو پھر جاگ اُٹھی لیکن مجبوری نے اُسے پھر جبراً اُسلا دیا۔ اور وہ آہستہ آہستہ فرم کی طرف بڑھ گیا۔

وہ آفس میں داخل ہوا۔ بابو رام سروپ کیشیر کے سامنے نوٹوں کے کئی ڈھیر لگے ہوئے تھے اور وہ گننے میں مصروف تھے۔ شنکر ایک دم ٹھٹھک گیا

آفس میں اور کوئی نہیں تھا۔

"کیوں نا۔ رام سروپ کا گلا گھونٹ کر یہ رقم چھین لی جائے"۔ اس کے دل میں بیٹھے شیطان نے آہستہ سے کہا۔ لیکن شنکر نے اس آواز کو وہیں بھینچ دیا۔

"گڈ نائیٹ بابو رام سروپ"۔ وہ سلام کرتا ہوا کرسی کی طرف بڑھ گیا۔

"گڈ نائیٹ شنکر۔ گڈ نائیٹ"۔ بابو رام سروپ نے جواب دیا۔ "آج تو تمہارے امتحان ختم ہو گئے ہونگے"۔

"جی ہاں"۔ شنکر نے لیجر کھولتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔ وہ زیادہ بات چیت کرنا نہیں چاہتا تھا۔

بابو رام سروپ پھر نوٹ گننے میں مصروف ہو گئے۔ شنکر نے بھی اپنی نگاہ لیجر کی رقموں پر ڈالنی شروع کر دی۔ ..... لیکن نامعلوم آج اسکا دل کیوں دھڑک رہا تھا۔ جی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے سینہ میں ایک جلن سی ہو رہی تھی۔ وہ کبھی کبھی رام سروپ کو دیکھ لیتا تھا ..... لیکن اس حالت کے باوجود بھی وہ کرسی میں دھنسا بیٹھا رہا۔

رام سروپ نے روپے کیش بکس میں رکھدیئے کاغذ پر کچھ لکھا اور بلوں کی فائیل اور کیش بک لیکر بوس کو دوسرے کمرے میں حساب سمجھانے چلے گئے۔ انہیں شنکر پر اعتماد تھا۔ لیکن آج اسکے ذہن پر شیطان غالب آچکا تھا۔ اس کے شیشہ کی طرح صاف دل پر سیاہی مائل لکیریں پڑ چکی تھیں۔ رام سروپ کے جاتے ہی

اس کا سانس تیز ہو گیا۔ چہرہ تمتمانے لگا۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں جھلک آئیں
وہ کچھ ٹھنڈ سی محسوس کر رہا تھا۔ اسکا کانپتا ہوا جسم کرسی سے اٹھا۔۔۔ اور کچھ ہی
دیر بعد اسکا ہاتھ کیش بکس کے اندر تھا۔ نوٹوں کی کئی گڈیاں اسکی گرم مٹھی میں تھیں
اور پھر اس کا ہاتھ پتلون کی جیب میں واپس آ گیا۔۔۔۔ اس نے کیش بکس بند کر دیا
اور کرسی پر آ بیٹھا۔ اس کے دل کی دھڑکن پہلے سے تیز ہو گئی۔ آنکھوں کے سامنے
اندھیرا چھا گیا اسکا رواں رواں کانپ اٹھا۔ اس نے لکھنے کے لئے قلم اٹھایا۔
لیکن جیسے انگلیاں پتھرا گئی ہوں ۔۔۔ مڑتی ہی نہیں ۔۔۔۔ اس نے زبردستی
قلم اٹھالیا اور الٹا سیدھا لکھنے لگا۔

رات کے دس بج چکے تھے۔ شنکر گھر میں داخل ہوا۔ اور اپنے کمرے میں
پہنچکر تمام دروازے بند کر لئے۔ جیب سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر میز پر رکھ
دیں۔ اسکا سانس پھر تیز ہو گیا۔ "اگر رام سروپ کو معلوم ہو گیا تو؟" اس کے
دل میں سویا ہوا انسان جاگ اٹھا۔ شیطان نے فوراً جواب دیا۔ "لیکن معلوم
کیسے ہو گا۔ وہ کہدیگا اُن کے شمار کرنے میں فرق ہو گا۔" کیش ان ہنڈ کیش بک
کے مطابق ٹھیک تھا۔ پھر گننے میں کیسا فرق۔ "تم چور ہو" انسان نے چیخکر کہا۔
شنکر لرز اٹھا۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے رام سروپ
بوس کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہے۔ بوس اسے برا بھلا کہہ رہے ہیں اور اس کی
آنکھوں سے بے گناہی کے آنسو بہہ رہے ہیں۔ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر گڑگڑا رہا ہے

اور اپنی بے گناہی کے ثبوت پیش کر رہا ہے لیکن بوس نے اس کی (ایک نہ سُنی) ——— اور نوکری سے علیحدہ کر دیا۔ شنکر کو ایسا معلوم ہوا جیسے مزدور نے مزدور کے پیٹ میں خنجر گھونپ دیا ہو۔ بھائی نے بھائی کا خون کر دیا ہو۔ اس کے خیالوں میں رام سروپ کے معصوم بچے بلک اُٹھے۔ بیوی کے چہرہ پر فاقوں کی پیلاہٹ پھیل گئی۔ چوری کے الزام نے رام سروپ کے لئے تمام نوکریوں کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ اور وہ گھر کے تاریک کونہ میں بیٹھا زار و قطار رو رہا ہے۔ بچے رو رہے ہیں۔ بیوی رو رہی ہے۔ سارا گھر رو رہا ہے ——— اور وہ رادھا کے ساتھ کشمیر کی رنگین وادیوں میں چھٹیاں گذار رہا ہے۔ خوشیاں منا رہا ہے ——— بے گناہ پھانسی کے تختہ پر تڑپ رہا ہے اور مجرم اُسے دیکھ دیکھکر لطف اندوز ہو رہا ہے۔

"نہیں، نہیں ——— یہ ہرگز نہیں ہو سکتا"۔ شنکر چیخ اُٹھا جیسے وہ غفلت سے جاگ اُٹھا ہو۔ نوٹوں کی گڈیاں پھر اس کی گرفت میں تھیں اور وہ بے اختیار تیزی سے باہر گھپ اندھیرے میں نکل گیا۔

"رام سروپ بابو...... رام سروپ بابو...... دروازہ کھولو"

شنکر ایک دروازے سے چپکا چیخ رہا تھا۔ دروازہ کھلا اور وہ بے اختیار کسی کے قدموں پر گر گیا۔ رام سروپ نے دونوں ہاتھوں سے شنکر کو اُٹھایا

اُنہیں یہ دیکھکر حیرت ہوئی کہ شنکر کے ہاتھوں میں نوٹوں کی گڈیاں ہیں اور ہاتھ اُنکی طرف بڑھے ہوئے ہیں۔

"یہ کیا ہے شنکر؟" رام سروپ نے پوچھا

"گناہ کا اعتراف...... دل کا سکون...... اور میری اُمیدوں کا خون" شنکر کے آنسو۔ ایک دم اُمنڈ آئے۔ "میں نے یہ کیش بکس میں سے نکال لیے تھے۔" شنکر کی گرفت ڈھیلی ہوگئی اور روپے رام سروپ کے قدموں میں پڑے تھے انہوں نے ایک جذبہ سے متاثر ہوکر شنکر کو گلے سے لگا لیا۔ اُن کی آنکھوں کی نمی میں شنکر کی عزت جھلملا رہی تھی۔ اب اُن کے دل میں شنکر کی عزت پہلے سے کہیں زیادہ تھی شنکر اِن سے الگ ہوا اور آہستہ آہستہ اندھیرے میں گم ہوگیا۔

"آج رادھا کشمیر جارہی تھی۔ اُس کا دوست...... اُس کا سچا ساتھی اب ٹیلے پر وہ کیسے اپنی غزل سُنائے گا۔ اُس کے سامنے کون اپنا رقص پیش کریگا اب رادھا اُس کے سینہ سے لگی دُور دھندلکے میں کچھ نہیں دیکھے گی۔ ٹھنڈی ہوائیں اب بھی چلیں گی۔ کھیت اب بھی لہلہائے گے۔ آفتاب اب بھی مغرب کے لال ساگر میں ڈوبے گا ـــــ لیکن رادھا کے بغیر ہر طرف سنّاٹا ہوگا۔"

ریل کی سیٹی سے وہ ایک دم چونک گیا۔ وہ تصورات کے اتھاہ ساگر سے باہر آیا۔ کشمیر جانے والی ٹرین سامنے کھڑی تھی۔ اسکی آنکھیں کسی کو تلاش کرنے لگیں۔

ایک کمپارٹمنٹ کے سامنے رادہا کے والدین کھڑے سامان رکھوا رہے تھے۔ وہ بھی ایک سفید ساری میں ملبوس وہاں کھڑی تھی۔ شنکر فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ اور اپنے آپ کو مسافروں کی بھیڑ میں چھپا لیا.......... رادھا ڈبہ میں بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد مہیش اسی کمپارٹمنٹ کے سامنے آکر رکا اور قلی سے سامان اندر رکھوا دیا۔ وہ قلی کو پیسے دیتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ جیسے کسی مقصد میں کامیاب ہو گیا ہو۔

گاڑی چیخی اور آہستہ آہستہ اسٹیشن پر رینگنے لگی۔ مہیش اندر ڈبہ میں گھس گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ دروازے کے بند ہوتے ہی شنکر کے سینہ میں ایک جھٹکا سا لگا۔ مہیش.......... اسکا رقیب....... اور اسکی رادہا کے ساتھ...... رادہا کے ڈبہ میں ـــــ کشمیر....... رادھا....... اور مہیش۔ وہ بوکھلا سا گیا۔ سامنے ٹرین جا رہی تھی۔ رادہا اور مہیش کشمیر جا رہے تھے ـــــ اور وہ تنہا پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔

نئے راون

انبوہ کو چیرتی ہوئی ایک کالے رنگ کی کار سڑک پر آئی اور زنّاٹے بھرتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔

"بولو شری رام چندر کی"

"جے"

ہزاروں فلک شگاف نعرے ایک ساتھ رام لیلا گراؤنڈ میں گونج گئے اور ایک تیر تیزی سے راون کے ڈیڑھ سو فیٹ اونچے کھڑے کاغذی پیکر میں پیوست ہوگیا

"دھائیں۔ دھائیں"

پٹاخے پھٹ پڑے

بجلیاں کڑک گئیں۔

ڈھول بج اُٹھے۔

باجوں سے جوشیلی دھنیں پھوٹ پڑیں۔

اور چاروں طرف جے جے کار اور ہاہا کار مچ گیا۔ آسمان و زمین کانپ اُٹھے۔ اور فضا میں تیروں کی بارش ہونے لگی۔ میدان میں گھمسان لڑائی شروع ہو گئی۔ برچھی رسالے اور برج فضا میں چکر کاٹنے لگے۔ دونوں طرف کی فوجیں اپنے جنگی جوہر دکھانے لگیں۔ کبھی رام کی سرخ فوج۔ راون کی سیاہ فوج پر ٹوٹ پڑتی۔ اور اس کے چھکے چھڑا دیتی۔ اور کبھی راون کی فوج سینوں پر چڑھ جاتی۔ زخمی اور بیہوش سپاہی زمین پر گرنے لگے۔ اور تڑپ تڑپ کر دم توڑنے لگے ——— کبھی رام کے لب میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھ کر مسکرانے لگے۔ اور کبھی راون کے ——— کبھی نیکی کے۔ کبھی بدی کے۔ کبھی سچ کے۔ اور کبھی جھوٹ کے ——— دونوں فوجیں کوچ پر کوچ کر رہی تھیں۔

سارا میدان بر تی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔

رات کے سائے بڑھتے جا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد دو تیر جنگی نوکوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ فضا میں تیرتے ہوئے اِدھر اُدھر سے آئے اور آپس میں ٹکرا کر گر گئے۔

"بولو شری رام چندر کی جے"

"جے"

ہزاروں تماشائی عقیدت سے چیخ اُٹھے۔ سیکڑوں تیر

ترکشوں سے نکل پڑے۔ آتشبازی زور زور سے
چھوٹنے لگی۔ ڈھول تیزی سے بجنے لگے۔

اور سبکی نگاہیں میدان کے وسط میں اسطرف پہونچ گئیں۔ جہاں یہ پاٹ کھیلا جارہا تھا۔

"شیلا۔ شیلا"

ایک بدحواس نوجوان تماشائیوں کی بھیڑ میں پکارتا ہوا آیا اور اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجمع میں کسی کو تلاش کرنے لگا۔

"ہٹ بے شیلا کے بچے سامنے سے" ——— ایک نے اُسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ اور وہ زمین پر منہ کے بل گرنے ہی والا تھا۔ کہ ایک دوسرا نوجوان بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے آیا۔ اور اُسے اپنی باہوں میں لیتے ہوئے بولا۔

"شیام بھیا۔ ملیں شیلا بھابی"

"نہیں لکشمن"

"گھر پر بھی نہیں پہونچی۔ میں دیکھ آیا"

"ہیں" ——— اور شیام کی آنکھیں پھیل گئیں۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ———

"دھائیں"

ایک پٹاخہ پھٹا اور بے اختیار دونوں کی نگاہیں میدان میں اُسطرف

اٹھ گئیں۔ جہاں رام لیلا ہو رہی تھی ۔ میدان کی فضا میں ایک تیر تیرتا ہوا جا رہا تھا۔ وہ تیر دیو پیکر راون کے کاغذی مجسمہ میں جا کر لگا۔ شیام کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ تیر اس کے کلیجے میں اتر گیا ہو ـــــــ اور وہ بے اختیار بھیڑ میں دوڑنے لگا۔

"کہاں جا رہے ہو۔ شیام بھیا ؟" لکشمن چیخا۔

لیکن شیام چپ رہا۔ اور آگے بڑھتا رہا۔ لکشمن بھی اس کے پیچھے بھاگا۔ شیام تیزی سے ان اونچے نیچے ٹیلوں پر چڑھ گیا جو رام لیلا گراؤنڈ کے مشرق میں کھڑے تھے اور جن کے پیچھے گھنے اور خوفناک جنگل تھے ۔ ان ٹیلوں پر بھی تماشائی بیٹھے تھے ۔

شیام ان سب سے بے نیاز آگے بڑھا اور ٹیلے کے ڈھال پر سے نیچے اترنے لگا۔ نیچے خوفناک اندھیرہ تھا۔

"شیام بھیا ۔ اُدھر نہ جائیے "

لکشمن پھر چیخا اور دوڑتا ہوا شیام کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"نہیں لکشمن مجھے چھوڑ دو" ـــــــ اور شیام ہاتھ چھڑا کر بے اختیار ڈھال پر دوڑنے لگا۔

اور وہ دونوں نیچے جنگل میں اتر گئے۔

جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی

"شی ـــ لا"

شیام چیخا ـ لیکن ۔ اسکی آواز گھنے درختوں کی شاخوں میں اُلجھ کر رہ گئی۔

کوئی جواب نہ آیا۔ وہ آگے بڑھا۔ اور پھر چیخا۔

"شی ۔ لا"

لیکن خاموشی رہی۔ لکشمن سراسیمگی سے شیام کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اُس کا چہرہ تمتما گیا تھا۔ اُسکی آنکھیں پھٹی پڑتی تھیں۔ سانس تیز تیز آرہا تھا اور قدم کانپ رہے تھے۔

"شیلا" ——— اس مرتبہ وہ زور سے چیخا۔

لیکن پھر وہی خاموشی۔ صرف سامنے کھڑی جھاڑیوں کے پیچھے سے سسکیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

"لکشمن! شیلا اِن نئے راہوں کے پاس بھی نہیں"

اور یہ کہکر وہ تیزی سے ٹیلے کی فرازی پر چڑھنے لگے ایک دیوانہ کی طرح۔ ایک پاگل کی طرح ——— اب اُس کی آنکھوں میں آنسو اُبل آئے تھے۔ لکشمن بھی اُس کے پیچھے دوڑا۔ لیکن وہ شیلا کو پکارتا ہوا پھر انبوہ میں اسطرح جا ملا جیسے پانی کی بوند بحرِ امواج کی طوفانی لہروں میں جا گری ہو۔

لکشمن اُسے ڈھونڈتا رہا۔

کالے رنگ کی کار ایک کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں آکر رکی۔ کمپاؤنڈ میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ کار کا دروازہ کھلا۔ اور اُس میں سے کئی سائے نکلے اور کسی چیز کو گود میں اُٹھا کر کوٹھی کے اندر چلے گئے۔

وہ ایک پر تکلف سجے ہوئے کمرے میں آئے اور ایک لمبے آدمی نے کپڑے میں لپٹی اس شے کو صوفہ پر ڈالدیا۔ اور خود سامنے کرسی پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ اور ہوسناک نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کے دیگر ساتھی باہر نکل گئے۔

اور کمرے کا دروازہ بند ہوگیا۔

کچھ دیر بعد کپڑے میں حرکت سی ہوئی اور ایک حسین دوشیزہ نے آہستہ سے منہ پر سے کپڑا اسطرح ہٹایا جیسے وہ ابھی ابھی نیند کی سبز وادیوں میں سے واپس آئی ہو اور جب اسے آہستہ آہستہ ہوش آیا تو وہ فوراً چونک کر بیٹھ گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس لمبے شخص کو دیکھنے لگی اور پھر خوف وغصہ کے ملے جلے لہجہ میں بولی۔

"کون ہو تم۔ مجھے میدان میں سے اٹھا کر یہاں کیوں لائے ہو؟"

"اسکا جواب ابھی مل جائیگا" ــــــ لمبا شخص نہایت اطمینان سے بولا اور یہ کہکر اس نے اپنی نگاہیں۔ دوشیزہ کے جسم کے ان عریاں حصوں پر مرکوز کردیں۔ جو ہری ساڑی میں ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے کسی ہری بھری جھاڑی میں گلاب کھل رہے ہوں۔ اس نے پھر کہا۔

"گھبراؤ نہیں شیلا۔ یہاں اور کوئی نہیں"

"تو تم میرا نام ...."

دوشیزہ صرف اتنا ہی کہہ سکی اور اسکی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور اس کا بایاں ہاتھ بے اختیار گداز سینہ پر آگیا۔

"ہاں۔ میں تمہارا نام بھی جانتا ہوں" ــــــ اور وہ ایک ڈراؤنا اونہ

بھیانک قہقہہ مار کر ہنس دیا اور کرسی سے کھڑا ہو کر شیلا کی طرف بڑھنے لگا۔ اُسکی آنکھیں ہوس کے نشہ میں چُور تھیں۔

"خبردار۔ جو مجھے ہاتھ لگایا"۔۔ شیلا شیرنی کی طرح گرجی۔ لیکن اُس آدمی کا قہقہہ اور بلند ہو گیا۔

"کمینے۔ ذلیل۔ بدمعاش۔ راون"۔۔۔ شیلا ایک سانس میں کہہ گئی اور فوراً اکھڑی ہو گئی۔

"میں جیون ہوں۔ راون نہیں۔ ہاہاہا"

اور کمرے کا بلب بجھ گیا......

"دھائیں۔ دھائیں"

رام لیلا گراؤنڈ میں پٹاخے پھٹ پڑے۔

آسمان و زمین لرز اُٹھے

چاروں طرف ایک طوفان آ گیا

اور راون میں آگ لگ گئی

"بولو۔ شری رام چندر کی"

"جے"

شعلے بلند ہو گئے۔ چنگاریاں فضا میں اُڑنے لگیں اور میدان میں کھڑے ہزاروں آدمی راون کے اس جلتے ہوئے کاغذی مجسمہ کو اس طرح دیکھنے لگے گو

نیا راون کی بدکاریوں اور بدفعلوں سے پاک ہو رہی ہو ——— لیکن نئی سیتا آج
بھی نئے راون کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔

اور اوپر آکاش میں دُور دُور تک چنگاریاں اُڑ رہی تھیں ———
چنگاریاں۔ لال، لال چنگاریاں۔ جیسے یہ چنگاریاں نہ ہوں، بلکہ راون کے
لہو کی بوندیں ہوں۔ اور ہر لہو کی بوند میں ایک نیا راون ننھے لگاتا پھر رہا ہو۔

"بولو۔ شری رام چندر کی!"

"جے!"
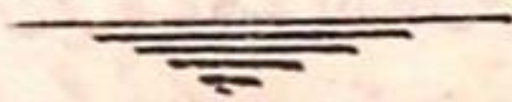
انتظار

(تمثیلی ڈرامہ)

منظر:۔ رات کا وقت ہے چاروں طرف خوفناک اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ آسمان میں کالے کالے بادل اس طرح اُڑ رہے ہیں۔ جیسے سینکڑوں شیش ناگ پھنکاریں مارتے پھر رہے ہوں سرد و خشک ہوا پاگلوں کی طرح درختوں سے اپنا سر پھوڑ پھوڑ کر چیخ رہی ہے لیکن ہوا کی اس تندی کے باوجود جنگل کے اس گوشہ میں رکھا ایک چراغ جل رہا ہے چراغ کی لو سانپ کی زبان کی طرح متحرک ہے ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جنگل میں سیہ پوش شیطان ٹانڈو رقص کرتے پھر رہے ہوں۔ پردہ جیسے ہی اُٹھتا ہے۔ آسمان میں بجلی چمکتی ہے اور بادل زور سے گرجتے ہیں (و) ہ منظر پر ایک سکوت چھا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص اندر داخل ہوتا ہے۔

اس شخص کے چہرہ پر ایک عجیب سی کشش ہے۔ اور آنکھوں میں کسی کا انتظار۔ اور اس انتظار کی وجہ سے اس کے چہرے کی بشاشت مفقود ہے۔ وہ جیسے ہی منظر کے درمیان آکر آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ برق چمک کر آسے آنکھیں سی دکھاتی ہے اور رعد ایک زخمی شیر کی طرح دھاڑ کر حملہ آور ہوتا ہے لیکن وہ ان سے بالکل متاثر نہیں ہوتا بلکہ اس کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آجاتی ہے اور فوراً ہی معدوم ہو جاتی ہے اور وہ بے خوف و خطر سامنے روش پر دیکھنے لگتا ہے۔ اچانک پردے کے پیچھے سے بہت سے گھنٹوں اور سنکھوں کے بجنے کی آوازیں آتی ہیں اور فضا میں گونجنے لگتی ہیں۔ ان آوازوں کے ساتھ ہی بارش کی چند بوندیں گرتی ہیں اور بادل کی گرج۔ بجلی کی چمک اس زور سے ہوتی ہے کہ اس شخص کی آنکھیں غیر اختیاری طور سے بند ہو جاتی ہیں۔ اتنے میں دوسرا شخص جلدی سے اندر داخل ہوتا ہے اور پہلے شخص کے بائیں طرف آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اُسکے شاہانہ لباس اور سر پر پہنے ہوئے تاج سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کسی ملک کا بادشاہ ہے اُسکے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند ہیں۔ جب پہلا شخص اپنی آنکھیں کھولتا ہے اور اپنی بائیں جانب دوسرے شخص کو دیکھتا ہے تو متعجبانہ انداز میں پوچھتا ہے۔

پہلا شخص:۔ کون ہو تم ؟ اس ویرانے میں شاہوں کا کیا کام ؟

دوسرا شخص:۔ (تکبرانہ لہجہ میں) میں ہوں، میں طوفان ، پانی ، ہوا اور آگ کے دیش کا راجہ ہا ہا ہا (قہقہہ لگاتا ہے) یہ دیکھ۔

اتنا کہہ کر وہ اپنی دونوں مٹھیاں کھول دیتا ہے اور آسمان کی طرف دیکھکر ایک اور قہقہہ بلند کرتا ہے اوپر بادلوں میں اس زور سے چمک اور گرج ہوتی ہے جیسے آسمان پھٹ گیا ہو ۔ اور اس کے بعد پانی کی موٹی موٹی بوندیں گرنی شروع ہو جاتی ہیں ۔ لیکن وہ فوراً اپنی مٹھیاں بند کر لیتا ہے ۔ پانی بند ہو جاتا ہے اور وہ کہتا ہے ۔

دوسرا شخص:۔ اگر میں چاہوں تو دنیا کو نیست و نابود کر دوں ۔ غرق آب کر دوں ۔ برق سے جنگلوں میں آگ لگا دوں ۔ سارے جہاں کو خاکستر کر دوں ۔ کیونکہ میری ایک مٹھی میں پانی اور دوسری میں آگ ہے ۔ ہا ہا ہا

پہلا شخص:۔ (سامنے روشنی پر دیکھتے ہوئے) میں جانتا ہوں کہ آپ ایسا کر سکتے ہیں لیکن میں آپکا یہاں آنے کا مطلب نہیں سمجھا ۔

طوفان:۔ (گرج کر) تو یہاں سے چلا جا ۔ میں یہی کہنے آیا ہوں ورنہ تجھے بجلی جلا کر بھسم کر دیگی ۔ ٹھنڈا پانی تیرا جسم گلا کر بے جان کر دے گا اور تیری لاش کا بھی پتہ نہ چلیگا ۔ کیونکہ یہاں سے ابھی میرا گذر ہونے والا ہے ۔

پہلا شخص:۔ میں آپ سے نہیں ڈرتا ۔ میں یہاں سے ہرگز نہیں جاؤں گا ۔ چاہے یہ رات

کتنی ہی طوفانی رات ہو۔ لیکن میرے لئے یہ وصل کی رات ہے۔

طوفان:۔ وصل کی رات۔ ہا ہا ہا۔ (قہقہہ لگاتا ہے) چلا جا۔ کیوں ناحق اپنی جان گنواتا ہے۔ یہ زندگی بار بار نہیں ملیگی۔

پہلا شخص:۔ (جھنجھلا کر) میں نہیں جاؤں گا۔ نہیں جاؤں گا۔

اسکی یہ جھنجھلاہٹ اور حکم کی نافرمانی دیکھکر طوفان کی آنکھیں قہر سے آگ برسانے لگیں اور وہ غصہ میں دانت پیستا ہوا گرجا۔

طوفان:۔ اچھا دیکھتا ہوں تو کیسے نہیں جاتا۔

اور یہ کہکر وہ اپنی دونوں مٹھیاں کھول دیتا ہے اور پیچ وتاب کھاتا ہوا چلا جاتا ہے اس کے جاتے ہی چاروں طرف سے بادل اُمنڈ آئے۔ سین کے پردے ہلنے لگے۔ بجلی تیزی سے چمکنے لگی اور پردے کے نیچے سے رعد کے گرجنے کی آوازیں آنے لگیں۔ آندھیوں کی سائیں سائیں سے فضا میں چیخیں سی گونجنے لگیں۔ درختوں کے تنے اور شاخیں چٹخنے لگیں اور آآ کر پہلے شخص کے منہ پر لگنے لگیں۔ لیکن وہ خاموش کھڑا رہا۔ اسکی آنکھوں میں اب بھی کسی کا انتظار تھا۔ کچھ دیر بعد ایک موٹی سی ڈال آ کر اس کے سر میں لگی اور وہ چکرا کر گر گیا۔ طوفان اور تیزی سے اُمنڈ آیا وہ آہستہ آہستہ سر کو ہاتھوں میں پکڑے ہوئے زمین پر سے اُٹھا اور ابھی پوری طرح کھڑا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ پھر دھڑام سے گر گیا۔ وہ پھر بامشکل تمام اُٹھا۔ اور زمین پر بیٹھ گیا اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ لیکن وہ روش کی طرف دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد بجلی کی چمک اس زور سے ہوئی

کہ اُس کی آنکھیں پھر چندھیا گئیں اور جب اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اُسے ایک سایہ اپنے طرف آتا ہوا نظر آیا۔ سایہ اوپر سے نیچے تک کالے کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا۔ صرف اُس کا کالا چہرہ اور کالے ہاتھ پاؤں کپڑوں میں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ اُس کے کالے مُنہ کے اِدھر اُدھر بال اس طرح لٹک رہے تھے جیسے کالے کالے ناگ جھول رہے ہوں وہ اُس کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا ہوا بولا۔

پہلا شخص:۔ کون ہے تو؟

سایہ:۔ (چڑیلوں کا سا قہقہہ لگاتے ہوئے) میں نا اُمیدی ہوں۔ ہی ہی ہی۔ تجھے جس کا انتظار ہے وہ اس طوفانی رات میں کبھی نہیں آئے گی۔ ہی ہی ہی۔ دیکھو راستے طوفانوں میں گم ہو چکے ہیں۔ گاؤں کی ندی میں سیلاب آ رہا ہے۔ تمام دروازوں کے کواڑ بند ہیں۔ وہ نہیں آئے گی۔ تو چلا جا۔ چلا جا۔ ورنہ مر جائے گا۔ ہی ہی ہی

پہلا شخص:۔ وہ ضرور آئے گی۔ وہ ضرور آئے گی۔ تو یہاں سے چلی جا۔ تو میرے پاس سے چلی جا۔

نا اُمیدی:۔ اچھا۔ تو ابھی تک کمبخت اُمید کے جنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ خیر ذرا اس کا انجام بھی دیکھ لے۔ ہی ہی ہی

(قہقہے لگاتی ہوئی چلی جاتی ہے)

اس کے جاتے ہی پہلے شخص کے سر کے زخم میں شدت کا درد ہونے لگتا ہے اور وہ کراہتا

ہوا زمین پر پیٹ جاتا ہے۔ بجلی چمکتی ہے۔ رعد دہاڑتا ہے آندھیوں کے چلنے کی آوازیں آتی ہیں اور اس پر ایک موٹی سی ڈال پھر آ گرتی ہے۔ وہ تڑپ کر رہ جاتا ہے اور شدتِ درد سے کراہتا ہوا کہتا ہے۔

پہلا شخص : ہاں اب نہ آنا راجو۔ نہ آنا۔ میں جانتا ہوں کہ تم اگر نہیں آئیں تو میرے انتظار کی شکست ہوگی اور ان طوفانوں کی جیت۔ میں جانتا ہوں کہ اگر تم نہیں آئیں تو نا امیدی اپنی فتح پر قہقہے لگائے گی۔ اور اُمید زار و قطار روئے گی اپنی ہار پر۔ اپنی شکست پر۔ اس کے باوجود تم نہ آنا۔ نہ آنا۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ طوفان اپنی لاج بچانے کے لئے تمہیں مجروح کرکے کسی انجانی شاہراہ پر پھینک دے۔ میں نہیں چاہتا کہ ندی کا سیلاب تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی آغوش میں چھپالے میں نہیں چاہتا کہ یہ برق تمہیں جلا کر اپنی تشنگی بجھائے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے گھر میں آرام کی نیند سوتی رہو۔ اور میں ان طوفانوں کے بیچ کھڑا تمہارا انتظار کرتا رہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ہر بلا سے محفوظ رہو اور میں عشق کا سر اونچا رکھنے کے لئے ان سے ٹکراتا رہوں۔ تم ہمیشہ خوش رہو راجو۔ ہمیشہ

اور وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اتنے میں آندھی کا ایک جھونکا آیا اور اس کے اوپر درختوں کے کچھ پتے پھینکتا ہوا چلا گیا۔ وہ ایک دم چونک گیا اور اپنے اوپر سے ڈال کو ہٹا کر بے اختیار کھڑا ہو گیا اور چیخا۔

پہلا شخص : ارے راجو۔ راجو تم آگئیں۔ تمہیں کچھ ہوا تو نہیں (کہیں چوٹ کوئی نہیں لگی) تم

کہاں ہو؟ سامنے کیوں نہیں آتیں

ایک ڈراؤنی آواز:۔ (پردے کے پیچھے سے آتی ہے) میں راجو نہیں۔ موت ہوں موت

اب بھی کچھ وقت ہے تو یہاں سے چلا جا۔ ورنہ میں بھی طوفان کے ساتھ

ساتھ آرہی ہوں۔ پھر تیری زندگی کوئی نہیں بچا سکے گا۔

پہلا شخص:۔ (نہایت اطمینان سے) راجو نہیں آئی۔ ٹھیک ہے۔

(زمین پر پھر گر پڑتا ہے)

اور اس کے گرتے ہی پردے کے پیچھے سے بادلوں کی گرج تیزی سے آنے لگتی ہے

اور کچھ دیر بعد طوفان اپنی دونوں مٹھیاں کھولے ہوئے موت کے ساتھ قہقہے

لگاتا ہوا اندر داخل ہوتا ہے موت کا رنگ اوپر سے نیچے تک آگ کی لپٹوں

کی طرح سُرخ ہے اسکے سر پر لال رنگ کا تاج لگا ہے۔ آنکھیں ایسی معلوم ہوتی

ہیں جیسے شعلے اُگل رہی ہوں۔ اُسکی مٹھیاں بھی کھلی ہوئی ہیں اور انگلیوں کے

سِروں پر خون لگ رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وہ اپنی ان لمبی لمبی

انگلیوں کو جاندار کے سینے میں گھونپ کر اپنے جسم میں اُسکا لہو کھینچ لیتی ہے

اسی لئے وہ آگ کی طرح سُرخ ہے۔ وہ دونوں آکر پہلے شخص کے پیروں کی

طرف کھڑے ہو جاتے ہیں اور قہقہے لگاتے ہیں۔

موت:۔ (پہلے شخص سے) آخر میں آہی پہنچی اور تو یہاں سے نہیں گیا۔ اب ہو جا

مرجانے کیلئے تیار ہی ہی ہی۔

پہلا شخص :- میں تیار ہوں۔

موت :- تو ختم کر دے اپنا انتظار۔ اور چھوڑ دے اُمید کا دامن

پہلا شخص :- ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ عشق کی توہین ہے۔

موت :- عشق کی توہین۔ ہی ہی ہی (قہقہہ لگاتی ہے) میں ابھی دکھتی ہوں تیرے عشق کی توہین :-

اتنا کہہ کر اُسکا قہقہہ قہر میں تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ ایک غضبناک انداز میں آگے بڑھتی ہے اور زمین پر اپنے پچھلے گھٹنے کو ٹیکا کر اگلے کے بل پر بیٹھتی ہے اور اپنی لمبی لمبی انگلیاں پہلے شخص کے سینے پر رکھ دیتی ہے اور اپنی آنکھیں پھاڑ کر دانت پیس کر سانس اوپر کو کھینچتی ہے۔ جیسے جیسے وہ سانس اوپر کو کھینچتی ہے پہلے شخص کا جسم پیلا ہوتا جاتا ہے۔ اور اس پر مُردنی طاری ہوتی جاتی ہے۔ اور کچھ دیر بعد اسکا چہرہ ڈھیلا سا ہو کر ایک طرف لٹک جاتا ہے۔ آسمان پھٹ سا جاتا ہے بجلی زور سے چمکتی ہے۔ رعد چنگاڑیں بھرتا ہے اور ہوا کا ایک تیز جھونکا آکر جلتے ہوئے چراغ کو گل کر دیتا ہے۔ موت اور طوفان ایکساتھ قہقہہ بلند کرتے ہیں اور پھر طوفان آہستہ آہستہ اپنی دونوں مٹھیاں بند کر لیتا ہے آندھیاں رک جاتی ہیں۔ بادلوں کی گرج ختم ہو جاتی ہے اور چاروں طرف سکوت چھا جاتا ہے۔ جیسے ہر طوفان کے بعد ہوتا ہے۔ موت بھی طوفان کے قریب آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور وہ بھی اپنی دونوں مٹھیاں آہستہ آہستہ بند کر لیتی ہے

طوفان۔ (پہلے شخص کے مُردہ جسم کو دیکھتے ہوئے) آخر مر ہی گیا۔ کہتا تھا۔ یہ مری وصل کی رات ہے۔ وصل کی رات۔ ہا ہا ہا (قہقہہ لگاتا ہے)

موت:۔ (طوفان کو مخاطب کر کے) مجھ سے کہتا تھا۔ میں نہیں جاؤں گا۔ عشق کی توہین ہے۔ عشق کی توہین۔ ہی ہی ہی۔

طوفان اور موت:۔ (دونوں ایک ساتھ) عشق کی ہار ہو گئی۔ حُسن بھی نہیں آیا۔ ہا ہا ہا۔ ہی ہی ہی (قہقہے لگاتے ہیں)

اسٹیج پر ایک شخص دوسری طرف سے آتا ہے وہ اوپر سے نیچے تک زرق برق کپڑوں میں ملبوس ہے اور اُس کے سُرخ و سفید چہرے سے نور ٹپک رہا ہے اور اس میں ایک عجیب سی چمک ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چودھویں رات کی چاندنی انسانی پیکر میں ڈھل کر یہاں آ گئی ہو۔

وہ۔ کون کہتا ہے میری ہار ہوئی۔ کون کہتا ہے میری شکست ہوئی۔ میری ہار کبھی نہیں ہو سکتی۔

موت:۔ (اس کی طرف دیکھکر) کون۔ عشق۔ یہ تو تو ہی کہتا ہے کہ تیری ہار کبھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن دیکھ، یہ مُردہ عاشق پڑا ہے

عشق:۔ (لاش کی طرف دیکھتے ہوئے) تو نے اس کے جسم ہی سے تو جان نکالی ہے جو مٹی کا ہے لیکن اس کا انتظار تو اب بھی زندہ ہے۔ اس میں تو اب بھی جان ہے اور اسی کو کبھی نہیں مٹا سکتی۔ دیکھ اس کی یہ کھلی

ہوئی آنکھیں اب بھی حُسن کا انتظار کر رہی ہیں۔ ان میں اب بھی انتظار جھلملا رہا ہے دیکھو اور خوب دیکھو۔

موت اور طوفان لاش کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ اُسکی آنکھوں میں وہی انتظار ہے جو پہلے تھا۔ وہی اُمید ہے جو پہلے تھی۔ وہ دونوں اپنے اپنے سر جھکا لیتے ہیں گویا اپنی شکست پر نادم ہیں۔ اور آہستہ آہستہ چلے جاتے ہیں۔ عشق بھی مسکراتا ہوا چلا جاتا ہے اس کے بعد ہی کسی حسین دوشیزہ کی آواز پردے کے پیچھے سے آتی ہے۔

آواز۔ شنکر میں آگئی۔ طوفان نے میرا راستہ روک لیا تھا شنکر۔ (اور وہ اسٹیج پر آتی ہے اور شنکر کی لاش کے قریب کھڑی ہو کر ایک ادا سے کہتی ہے) مجھے لیٹے لیٹے کیا دیکھ رہے ہو۔ اُٹھو اور اپنی راجو کو معاف کر دو نا۔ (لیکن اُسے کوئی جواب نہیں ملا۔ تب وہ گھبرا کر شنکر کے مُردہ چہرے کو دیکھتی ہے اور اُسکی بے اختیار چیخ نکل جاتی ہے) شنکر

(اور پردہ گر جاتا ہے)

بلیدان

آج ریزلٹ آؤٹ ہوا تھا

وہ فیل تھی۔ لیکن شاد تھی۔ مسرور تھی۔ مطمئن تھی۔

نامعلوم کیوں ۔؟

وہ رنجور تھا۔ حالانکہ پاس ہو گیا تھا۔ اور اچھے نمبروں سے۔ کتنا تضاد تھا۔

کتنا فرق تھا۔

کتنی محبت تھی۔

دونوں میں۔

دونوں بی۔اے کے طالب علم تھے۔ لیکن غریب۔ اور غریبی ہی نے دونوں کو ایک دوسرے کے بہت نزدیک کر دیا تھا۔

"میری مٹھائی" ــــ وہ اپنی چنچل آنکھوں کو مٹکاتے ہوئے بولی

"مجھے کوئی خوشی نہیں" ــــ اُس نے کہا۔

"کیوں" ــــ؟

"کیونکہ ......" ــــ اس کے علاوہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ فوراً بولی

"کیونکہ میں فیل ہو گئی ہوں۔ میں پاس ہوں دیپ۔ پاس ــــ کیونکہ تم پاس ہو۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ بہت خوش۔ ایک کلی کی طرح"

وہ بے اختیار کہہ گئی اور واقعی، وہ ایک کلی کے مانند جھوم رہی تھی۔

"اگر تم مجھے اُداس کرنا چاہتے ہو اور پشیمان تو یہ تمہارا شیوہ نہیں" ــــ

"نہیں۔ نہیں۔ میں یہ کب چاہتا ہوں" ــــ دیپ فوراً بولا ــــ اور اُس کے مُرجھائے لب خود بہ خود متبسّم ہو گئے۔

"تو میری مٹھائی" ــــ اوشا نے کہا۔

"وہ کل آئے گا۔ ریزلٹ آج ہی تو آؤٹ ہوا ہے اور پھر دوست بھی تو اصرار کر رہے تھے"

"ضرور" ــــ اور وہ ہنسنے لگی۔ کتنی چمک تھی اُسکی آنکھوں میں۔

دیپ بھی مسکرا رہا تھا

اور کچھ دیر بعد دونوں پُل کے اوپر سے اُتر آئے۔

وہ روز یہاں ملتے تھے۔

نیچے دریا بہہ رہا تھا۔

دیپ اپنے کمرے میں آیا اور صندوق میں کچھ ٹٹولنے لگا۔ لیکن اس کا ہاتھ خالی نکل آیا۔ پھر وہی ہاتھ اس کی جیب میں بے اختیار چلا گیا۔ جیب میں بھی ایک پیسہ نہیں تھا۔ خالی تھی۔ ہمیشہ کی طرح۔ وہ مزید افسردہ ہوگیا۔ اس کے سامنے تاریکی پھیل گئی۔ —— وہ کل مٹھائی کیسے خریدے گا؟ —— اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ وہ والدین سے نہیں مانگ سکتا۔ کیونکہ وہ بہت تنگ دست تھا۔ اس کی غیرت نے اس پر آمادہ نہیں کیا۔ وہ اپنے شناساؤں سے بھی اُدھار نہیں لے سکتا۔ کیونکہ پچھلے اُدھار نے اس کا منہ بند کردیا تھا۔ وہ مقروض بھی تھا۔ وہ چوری بھی نہیں کر سکتا تھا —— وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا کرے —— ؟ —— ہر سو بھیانک اندھیرہ پھیلا ہوا تھا۔ یکایک اس اندھیرے میں ایک کرن پھوٹی۔ اور اس کی روشنی میں اسے کتابیں نظر آئیں۔ اس کی عزیز ترین کتابیں، جنہیں وہ دل و جان سے زیادہ پیار کرتا تھا۔ ان میں کچھ ایسی کتابیں بھی تھیں جو اسے انعام میں ملی تھیں اور جو ثبوت تھیں اس کی قابلیت کا اور اس کی فتحیابی کا۔

وہ فوراً الماری کے قریب آیا۔ کتابیں نکال کر زمین پر رکھدیں۔ اب اس کے دل سے ان کتابوں کی وقعت بالکل مفقود ہو چکی تھی۔ لیکن جب وہ الماری کے پاس سے واپس ہوا تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں، ہزار کوششوں کے باوجود وہ اشکوں کو نہ روک سکا۔ اور آنسو بہنے لگے۔ وہ اپنی ڈھیلی ڈھالی چارپائی پر گر گیا۔ بالکل بے سدھ۔ اس نے الماری کی

طرف دیکھا۔ وہ خالی تھا۔ صرف چند کاپیاں پڑی تھیں۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کا ذہن بھی خالی ہو گیا ہو۔ اُس میں کچھ لوجِک نہیں۔ کچھ قابلیت نہیں۔ وہ جاہل ہے۔ بالکل جاہل۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا گویا کمرے کی زینت ختم ہو گئی ہے۔ وہ ویران ہو گیا ہے اور خاک دھول اور جالوں سے بھرا پڑا ہے۔ اُسے وحشت سی ہونے لگی۔ اُس کا عزم ڈگمگانے لگا۔ لیکن اُس کے سامنے اُس کی مُسکراتی ہوئی اوشا اُبھر آئی جیسے وہ اُداس کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ فوراً اُٹھا۔ کتابوں کو بغل میں دبایا اور بے اختیار باہر نکل گیا۔

وہ ایک بُک سیلر کی دکان پر کھڑا تھا۔

اُس کی کتابیں اُس کے سامنے بکھری تھیں۔

"آدھی قیمت پر خریدوں گا" ــــ بُک سیلر بولا۔

"صرف آدھی قیمت پر" ــــ اُس کے منہ سے نکلا ــــ "کتابوں کی حالت بالکل درست ہے۔ پون قیمت لگائیے"!

"پون پرائز پر تو ہم بیچتے ہیں" ــــ بُک سیلر بولا۔ "یہ دیکھئے۔ آج سے کچھ دن پہلے ہم نے یہی کتابیں آدھی قیمت پر خریدی تھیں"۔

بکسیلر نے دیپ کے آگے بہت سی کتابیں پھینک دیں۔ دیپ نے ایک کتاب اُٹھائی جسے وہ کہیں پر دیکھ چکا تھا۔ اُس نے سرورق کھول کر دیکھا۔ ایک کونے پر نام لکھا تھا۔

"اوشا جین"

اُس نے سب کتابیں دیکھ ڈالیں۔ کئی پر اوشا کا نام لکھا تھا۔ اُسی کی تحریر تھی وہ اچھی طرح پہچان گیا۔ اسکا سر گھومنے لگا۔ آج سے کئی ماہ پیشتر جب کالج سے اُس کا نام فیس جمع نہ کرنے کی وجہ سے کٹ گیا تھا۔ اوشا ہی نے اُسکی فیس جمع کرائی تھی۔ وہ بھول سا گیا تھا کیونکہ اوشا نے صرف اُس کو رسید دی تھی۔ اُس نے روپیہ خود جمع کئے تھے۔

ایثار

قربانی

بلیدان

اُسے ایسا معلوم ہوا گویا اوشا نے اپنی کتابیں بیچکر اُسکی فیس دی تھی اور وہ کتابیں نہ ہونے کی وجہ سے فیل ہو گئی ہے۔ اُس نے بتایا بھی نہیں۔ اُس کے ذہن پر ہتھوڑے سے پڑنے لگے۔ سینہ میں ایک جوالا مکھی سا بھبک اُٹھا۔ وہ اور اُداس ہو گیا۔

"لائیے" ——— وہ بامشکل تمام اتنا کہہ سکا۔

بُک سیلر نے کتابوں کی قیمت ادا کی۔ اور وہ روپیہ مٹھی میں لیکر وہاں سے چلا گیا۔

اگلا دن ہوا۔

آج آکاش میں کالے کالے بادل منڈلا رہے تھے ہر طرف بھوری بھوری روشنی پھیلی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ خلا میں رنگ برنگے طائر پرواز کر رہے تھے۔

ساری فضا پر ایک کیف سا طاری تھا

دیپ تنہائی پر کھڑا تھا۔

وہ اُجلے کپڑوں میں ملبوس تھا۔ قمیض نہایت سلیقے سے پینٹ میں اُڑسی تھی۔ بالوں میں خوشبو دار تیل پڑا تھا۔ اور وہ دلکش انداز میں کڑھے تھے۔ اُس کے بُشرے پر بشاشت تھی۔ اچانک اُسکی نگاہ سامنے پگڈنڈی پر گئی۔ پگڈنڈی ہرے ہرے کھیتوں کو چیرتی ہوئی دُور تک چلی گئی تھی۔ اُس پر اوشا آ رہی تھی۔ وہ سفید ساڑھی پہنے تھی، ہوا کے تیز جھونکوں سے ساڑھی اُس کے سڈول جسم پر چپک گئی تھی۔ اور اُس کے نقوش اُبھر آئے تھے۔ اُس کے بال لہرا رہے تھے۔ وہ بہت شاد تھی۔ اُس نے وہیں سے اپنا ہاتھ فضا میں ہلایا۔ دیپ نے بھی ہلایا اور مُسکرانا لگا۔

وہ ہنستی ہوئی پُل کے اوپر چڑھ آئی۔

"آج موسم بہت سُہانا ہے" وہ بولی۔

"ہاں" دیپ نے ہنستے ہوئے جواب دیا

"میری مٹھائی" وہ پھر بولی۔

"یہ لیجئے" دیپ نے ایک کاغذی تھیلی اُسکی طرف بڑھا دی۔

اوشا نے فوراً لے لی۔ اور اُسے بے اختیار سینہ سے لگایا جیسے کوئی انمول شے ہو۔

یکایک آسمان میں چمک ہوئی اور رعد زور سے دہاڑا وہ دونوں سہم گئے اور آکاش میں دیکھنے لگے۔ ہر سو کالے بادل چھا گئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے

دنیا کے چاروں طرف آگ سُلگ رہی ہو۔ کالا کالا دھوآں اُٹھ رہا ہو اور آسمان کے بیچ آ کر ٹکرا رہا ہو۔ ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور موٹے موٹے اولے گرنے لگے اوشا بہت پریشان تھی۔ پُل پر کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں یہ بیٹھکر اپنی حفاظت کرتے۔

دیپ ہنسنے لگا۔

نامعلوم کیوں؟

اولے زور زور سے گرنے لگے۔ بجلی چمکنے لگی۔ بادل گرجنے لگے۔ چاروں طرف خوفناک اندھیرہ چھا گیا۔ اوشا دوڑی۔ لیکن دیپ نے اُسکی کلائی پکڑ لی۔ اور اُسے اپنے سینے سے لگا لیا اور اُس کے اوپر جھک گیا رعد پھر ایک زخمی شیر کی طرح دہاڑا۔ آندھیاں چلنے لگیں۔ اور موٹے موٹے اولے دیپ کے جسم پر پڑنے لگے۔ لیکن وہ اوشا کو سینہ میں چھپائے کھڑا رہا۔ وہ بھی آنکھیں بند کئے اس کے سینے سے چمٹی رہی دیپ نے اوشا کے ایک بھی اولا نہ لگنے دیا۔ ژالہ باری تیز ہو گئی۔ لیکن وہ کھڑا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ اوشا کی حفاظت کیلئے ان تمام طوفانوں سے ٹکرا رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ژالہ باری ختم ہو گئی لیکن بارش ہوتی رہی وہ دونوں بھیگ چکے تھے دیپ کا سارا جسم زخمی ہو گیا تھا۔ اُس کی کمر سوج گئی تھی اور سر میں سے لہو بھی نکل رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کے لبوں پر ایک مُسکراہٹ تھی۔ دیوتا کی سی مسکراہٹ جیسے کسی دیوتا نے کوئی بلیدان منظور کر لیا ہو اور آج اُسکا صلہ دیکر شاد ہو

"اب تو مجھے چھوڑ دیجئے"۔ اوشا دیپ کے سینہ سے الگ ہو گئی۔

" اب ہمیں کوئی نہیں چھڑا سکتا اوشا۔" دیپ بولا ۔" میں نے ہمیشہ کے لئے تمہاری کلائی پکڑلی ہے اگر اسی طرح دنیا کی طوفان بھی ہمارے درمیان حائل ہوا۔ میں اس سے بھی ٹکرا جاؤں گا لیکن تم پر کوئی آنچ نہ آنے دونگا"

یہ کہہ کر دیپ لڑکھڑانے لگا۔ لیکن اوشا نے اسکی کمر میں ہاتھ ڈال کر سہارا دیا۔ دیپ گر نہ سکا اور دو بھیگے جسم آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔

اور بارش بھی کم ہو گئی۔

مزاحیہ

معجزۂ فن

میرے ایک مولوی ٹائپ بزرگ گنگیرد ضلع مظفر نگر سے تشریف لائے ہوئے تھے ایکدن میں انھیں اکبر آباد دکھانے کی غرض سے گھر سے باہر نکلا۔ ابھی میں انھیں لے کر سڑک پر ہی آیا تھا کہ دوسری جانب سے آواز آئی۔

"اسلام علیکم"

"وعلیکم السلام" ــــــ میں نے جواب دیا۔ مولوی صاحب نے پوچھا۔ یہ کون صاحب تھے؟

"شاعر" میں نے کہا۔

"اچھا تو آپ افسانہ نویسی کے علاوہ شاعری بھی کرتے ہیں"

"جی۔ کبھی کبھی یوں ہی کہہ لیتا ہوں"

یہ سنکر مولوی صاحب کی کشادہ پیشانی پر ایک لکیر پڑ گئی اور انکی ناک اوپر کو

چڑھ گئی ۔ گویا تفریح کا افتتاح ہی غلط ہوا ہے ۔

" اسلام علیکم " ـــــ ایک آواز پھر ہمارے کانوں کے پردوں سے ٹکرائی ۔

" وعلیکم السلام " ـــــ میں نے جواب دیا ۔

" یہ کون تھے ؟ " مولوی صاحب نے پھر پوچھا

" شاعر " ـــ میں نے کہا ۔

اور مولانا کے ماتھے پر دوسری لکیر پڑ گئی ۔ اور ناک مزید اوپر کو چڑھ گئی جیسے سارے بازار میں کتے مرے پڑے ہوں اور اُن کی تعفن نے صرف ہمارے مولانا کی ناک کے نتھنوں کو اپنا دولت خانہ بنا لیا ہو ۔

" اسلام علیکم " ـــــ اس مرتبہ میں نے آواز بلند کی ۔ اُدھر ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے ہاتھ ماتھے پر اس طرح رکھ لیا جیسے وہاں پر شہد کی مکھی کے چیت لگا دی ہو ۔

" یہ کون بزرگ تھے ؟ " ـــــ مولانا نے اپنا آموختہ دُہرایا ۔

" یہاں کے استادوں میں سے ہیں " ـــــ میں نے کہا ۔

" یعنی شاعر " ـــ مولوی صاحب ذرا چڑ کے بولے اور میں نے دیکھا کہ ان کے ماتھے پر تیسری لکیر بھی پڑ گئی اور ناک نے ایک قدم اور ماتھے کی طرف بڑھا دیا ۔ اب مجھے تشویش ہوئی کہ اگر جلد سے جلد کسی غیر شاعر دوست یا بزرگ کے نیاز حاصل نہ ہوئے تو ہمارے مولانا کی پیشانی سکڑ کر گُدی پر پہونچ جائیگی اور سر کے بال کمر کے پیچھے پہنچ کر جھولنے لگیں گے اور ناک گنجے سر کے وسط میں جا کر آسمان کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو جائے گی ۔ اور منہ کو داڑھی

کے سیاہ بال ڈھک لیں گے۔ لیکن خوبیٔ بخت دیکھئیے کہ میں نے اپنے تصور میں آسمان و زمین کے چودہ طبق چھان مارے۔ مجھے کہیں بھی کوئی غیر شاعر دوست نظر نہیں آیا تاکہ اُس کے ذریعہ اگر میں اپنے مولانا کی پیشانی کی لکیروں کو مٹانے میں ناکام رہوں تو کم از کم ایک لمبا سا ڈیشس یا فل سٹوپ تو درمیان میں لگا سکوں۔ جب بھی میں نے کسی اندھیری گلی میں مکان کے نیچے کھڑے ہو کر اپنے غیر شاعر دوست کو پکارا تو اُنکی والدہ ماجدہ یا ہمشیرہ صاحبہ نے بڑے تنک کر جواب دیا۔ "گھر میں نہیں ہیں جی"—— میں اپنا سر کھجاتا اور کن انکھیوں سے مولوی صاحب کی کارٹونی صورت دیکھتا اُس اندھیری گلی میں سے نکل آتا اور سڑک پر سلام کرتا۔ سلام لیتا اور مولانا کے "کون ہے" کا جواب "شاعر" دیتا آگے بڑھ جاتا۔

ہم تفریح کے نام پر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ مولانا کی پیشانی لکیروں سے بھر چکی تھی۔ بہت سی لکیریں تو ایک دوسرے پر چڑھ گئی تھیں۔ ناک کے نتھنے ایسے ہو گئے تھے جیسے ایک کتا دوسرے کتے کو غراتے ہوئے کر لیتا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ مولانا کو آگرہ پسند نہیں آیا۔ کیونکہ بد قسمتی سے پہلی ملاقات ایک شاعر سے ہوئی تھی اور شاعروں سے مولانا کو ازلی چڑ ہے۔

ہم تمام دن پھرتے پھرتے تھک گئے تھے اور اِسی لئے اب ہمارے قدم آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے۔ ایک جگہ ہم نے دیکھا کہ ایک مسجد کے اندر سے ایک نابینا شخص نکلا۔ اور مسجد کی دیوار کا سہارا لیکر دہ زمین میں کچھ ٹٹولنے لگا۔ وہیں دیوار کے نیچے

ایک دوسرا شخص سر جھکائے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ نابینا شخص اُسکے قریب آیا اور جلدی سے اُسکا سر پکڑ لیا۔ دوسرا شخص چونک گیا اور بولا۔

"موذن صاحب کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔ ذرا استنجے کیلئے ڈھیلا ڈھونڈ رہا ہوں۔ تم کون ہو؟"

دوسرے شخص نے ذرا اکڑ کر جواب دیا ——— "میں شاعر ہوں شاعر آج مسجد کے سایۂ دیوار کے نیچے بیٹھکر شاعری کر رہا ہوں۔ آج محبوب نے تو میرے پیچھے کتے دوڑا دیئے۔"

اتنا سننا تھا کہ میں ایک دم چیخ پڑا۔ کہیں ان جملوں کو مولانا نہ سن لیں اگر ان کے کان اِن جملوں سے آشنا ہو جاتے تو ان کی ناک۔ پیشانی سر اور داڑھی کے بال اپنی اپنی قیام گاہیں چھوڑکر کمر کی طرف بھاگ جاتے اور ادھر میری ناک بھی کٹ جاتی۔

"آپ شاعروں سے اتنے گریزاں کیوں ہیں؟" ——— آخر میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔

بولے ——— "اجی بس میاں صاجزادے آسمان و زمین کے قلابے ملاتے رہتے ہیں —— نہ لینا ایک نہ دو اور نہ تین۔"

اتنا سنتے ہی میں نے اُن کے دونوں ہاتھ مضبوط پکڑ لئے کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں یہ تین کہکر سڑک پر بھاگنا شروع نہ کردیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا بلکہ وہ اپنی جگہ ہی پر رہے اور انہوں نے میرے ہاتھ سے اپنے دونوں ہاتھ چھڑا لئے اور بولے۔

"تم نے قرآن شریف میں شعراء کے بارے میں آیت پڑھی ہے ؟"

"نہیں" ـــــ میں نے جواب دیا

"قرآن شریف پڑھا ہے ؟"

"نہیں ۔ آپ آگئے ہیں ۔ اب پڑھوں گا"

جب میں نے یہ الفاظ کہے تو ہوا کا ایک ٹھنڈا سا جھونکا آیا اور پھر بارش شروع ہوگئی ۔ ہمارے جسم تر ہوگئے ۔ اور ہمیں ایک جھرجھری سی آگئی ۔ ہم بھاگ کر ایک عالیشان کوٹھی کے دروازے میں گھس گئے ۔ سڑک پر سناٹا چھا گیا ۔ بارش تیز ہوگئی اور ہمارے بدن سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ٹکرانے لگے ۔ اتنے میں کوٹھی کے اندر سے ستار کے بجنے کی آواز آنے لگی ۔ ستار کے تاروں کی مدھ جھنکار نے مجھے بے خود سا کر دیا اور کچھ دیر بعد ایک سریلی اور پُر سوز نسوانی آواز ستار کے نغمہ کے ساتھ آنے لگی ۔

وہ بہاروں میں یاد آگئے
زخم دل کا ہرا ہوگیا
تو کہاں ہے تری یاد میں
آرزوؤں کا خوں ہوگیا

وہ گاتی رہی ۔ دیر تک گاتی رہی ۔ ہم سنتے رہے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی حسین دوشیزہ اپنی گھنی اور سیاہ زلفوں کو شانوں پر بکھیرے کسی پُر تکلف سجے ہوئے کمرے کے وسط میں بیٹھی کسی کی جدائی میں گا رہی ہو ۔

جب نہ آیا کوئی رات بھر
تھک کے بیمارِ غم سو گیا

کچھ دیر بعد بارش بند ہو گئی۔ اب میں نے یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے مولانا سے کہا۔

"چلئے حضور بارش بند ہو گئی"

ذرا ٹھہرو۔ صاحبزادے۔ یہ غزل سُن لیں۔ اسوقت کیسی بھلی لگ رہی ہے"

مولانا کا یہ جواب سنکر میری حیرت حد سے باہر نکل گئی۔ میری آنکھیں پھیل گئیں اور منہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔

دھیمی دھیمی آواز برابر آ رہی تھی ؎

اُسکو خوشیوں کی منزل ملی
غم کی راہوں میں جو کھو گیا
فکر آوارۂ شاعراں
زلفِ محبوب میں کھو گیا

میں نے مولانا کی پیشانی کو دیکھا۔ اب اس پر ایک بھی لکیر نہیں تھی ناک اپنی جگہ آ گئی تھی اور اُن کے چہرے پر نشے کے سے آثار نمایاں تھے۔ اور وہ جھوم سے رہے تھے ——— آواز برابر آ رہی تھی ؎

آ گئے خواب میں جب کبھی یاد کر کے اُنھیں سو گیا

"بھوں۔ بھوں ــ بھوں۔ بھوں" ــــــ اور کوٹھی میں سے ایک موٹا تازہ کتا بھونکتا ہوا آگیا۔ میں نے دروازے ہی میں سے چھلانگ لگا دی اور سڑک پر آگیا۔ مولانا پر کتے کا ڈر غالباً زیادہ غالب آگیا تھا۔ یا پھر غزل اور نغمہ کا اثر زیادہ تھا۔ اسلئے وہ ضرورت سے زیادہ اُچھل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کوٹھی کے دروازے سے بڑے زور سے ٹکرائے اور باہر سڑک پر آکر گرے اور بارش کے پانی میں لت پت ہو گئے۔ میں نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر جلدی سے اُٹھایا۔ جب وہ اُٹھے تو اُن کے منہ سے "کتے" کے لئے گالیاں نکل رہی تھیں اور غزل اور نغمہ کی خوب تو یفیں۔

سُریلی اور مدھم آواز برابر آ رہی تھی ؎

ڈھونڈنے مجھکو نکلی خوشی
غم کی وادی میں جب کھو گیا

وہ پھر رُک گئے۔ حالانکہ اُن کے چوٹ بہت آئی تھی۔ اور کئی جگہ سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ کھڑے رہے۔ ستار بج رہا تھا۔ اور وہ گا رہی تھی ؎

تیری آنکھوں نے جو کچھ کہا
رو بہ رو دل نشیں ہو گیا

وہ کھڑے رہے۔ میں اُن کے قریب آگیا۔ ہوا کے سرد جھونکے اُسکی آواز کو اس سُہانی فضا میں بکھیر رہے تھے اور آکاش میں چاند کالے بادلوں میں تیزی سے

چھپ گیا۔ وہ متواتر گا رہی تھی ؎

قوم اسرار سو جائے گی

شاعرِ قوم گر سو گیا

یہ سنکر میرے اوپر ایک کیف سا طاری ہو گیا اور میرے دل میں آیا کہ
یں اس حسینہ کے پاس پہنچکر اسے اپنی باہوں میں بھینچ لوں وہ میری غزل گا
رہی تھی اور اس درد بھرے انداز میں یہ غزل میں نے پچھلے دنوں ریڈیو اسٹیشن
پر پڑھی تھی۔ میں بے خود سا کھڑا رہا اور مولانا کے دونوں ہاتھ میری طرف
بڑھے اور انہوں نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں بھی اُن کے سینے سے لگ گیا
چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ اُس کی آواز اسطرح بند ہو گئی جیسے کوئی آسمانی
حور اپنے نغموں کی بارش کر کے گھنگھور بادلوں میں گم ہو گئی ہو۔ چاند بادلوں میں
چھپا رہا۔ اور جب میں اُن کے سینے سے الگ ہوا تو اُن کے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں بھی
غیر شعوری طور پر افسردہ ہو گیا اور میں نے اُنکی آنکھوں میں نہ صرف اپنی بلکہ تمام فنکاروں
کی عزت جھلملاتے ہوئے دیکھی۔ چاند کانے بادلوں سے باہر آ گیا اور آکاش کے نیل میں
تیرنے لگا۔ چاروں طرف چاندنی پھیل گئی۔ سفید اور ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی ۔۔۔ اور ہم
گھر کی طرف روانہ ہو گئے وہ لنگڑاتے ہوئے چل رہے تھے میری شوخی پھر جاگ اُٹھی اور میں کسی کا
شعر گنگنانے لگا ؎ ٹھکرا کے غر ہو گئے لنگڑے، ادا بڑھی!

اب چلئے خوب شوق سے کوُلھا اُچھال کے

بھیانک اندھیرا

وہ آگرے کی مشہور شوز مارکیٹ کی ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم تھا۔ محرّر۔ منشی۔ اکاؤنٹنٹ تمام دن فرم کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا کھاتے لکھتا رہتا۔ بلیں بناتا۔ اور آڈر بک کرتا۔

وہ فرم میں صبح نو بجے آتا تھا۔ دوپہر کو کبھی دو بجے چلا جاتا۔ کبھی چار بجے۔ اور کبھی کبھی جاتا بھی نہیں تھا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے ـــــ اگر چلا بھی جاتا تو کچھ دیر بعد پھر واپس آجاتا اور رات کے گیارہ بجے تک کھاتوں میں اُلجھا رہتا۔ دن گذر جاتا۔ شام گذر جاتی اور آدھی رات۔ لیکن وہ سر جھکائے کھاتوں میں لکھتا رہتا۔ اسکی ملازمت کا کوئی وقت مقرّر نہیں تھا۔ کیونکہ وہ ایک پرائیویٹ فرم کا محرّر تھا۔ ایک جوتوں کی فرم کا نوکر۔ اُس کا کوئی اصول نہیں تھا۔ جسکی وجہ سے اس کی آنتیں گل گئی تھیں۔

چہرہ میلا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ جسم لاغر ہو گیا تھا۔ کمزور۔ دُبلا۔ اور پتلا۔ ایک مرجھائی شاخ کی طرح —— جب وہ چلتا۔ ایسا لگتا۔ گویا ہڈیوں کا ڈھانچہ چل رہا ہے۔ دنیاوی دلکشیوں اور رعنائیوں سے بے نیاز۔ اُکھڑا اُکھڑا سا سانس۔ دھنسی دھنسی سی آنکھیں۔ ڈگمگاتے سے پاؤں —— اُسے سُہانی صبح کے روح پرور حسین نظارے بلاتے رہ جاتے۔ لیکن وہ فرم میں گھس جاتا۔ رنگین شام کی دلہن شفق کا غازہ رخساروں پر مل کر اُسے دعوتِ حسن دیتی۔ لیکن وہ فرم کے تاریک کونہ میں بیٹھا رہتا۔ چاندنی رات ستاروں سے مزّین ڈوپٹہ اوڑھے اسکے سامنے آتی اور اشاروں سے بلاتی۔ لیکن وہ اپنے گھر کی چاردیواری میں تھکا ماندہ پڑا رہتا۔ بے پرواہ سا۔ بیمار سا۔ وہ اپنی صحت فرم کے کھاتوں کی نذر کر چکا تھا۔ جب وہ کورے کورے کاغذوں پر لکھتا اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ اپنے خونِ جگر میں قلم ڈبو ڈبو کر لکھ رہا ہے —— لہو دن بدن کم ہوتا گیا۔ سوکھتا گیا۔ خشک ہوتا گیا اور وہ اپنے لال لہو سے سیٹھ کے کھاتوں کو رنگین بناتا رہا —— اور اُسے اس زبردست قربانی کا صلہ تنخواہ کی شکل میں ملتا رہا۔ تنخواہ۔ صرف تنخواہ۔ —— جس سے وہ اپنے گھریلو اخراجات پورے کرتا۔ اپنا۔ اپنی اہلیہ اور تین معصوم بچوں کا پیٹ پالتا۔ اور بس۔ کچھ نہیں کرتا۔ گھر یا فرم۔ فرم یا گھر۔ جیسے یہی اسکی زندگی کی منزلِ مقصود ہے تاریک۔ ویران اور اُجڑی سی منزلِ مقصود۔ جو دلچسپیوں اور دلکشیوں سے محروم تھی۔ وہ اُکتا سا گیا تھا۔ اس منزل سے۔ اس

زندگی سے۔ اس دنیا سے۔

دن گذرتے رہے۔

اور وہ سر جھکائے کام کرتا رہا۔ فرم کے ایک گوشہ میں بیٹھا۔ تنہا۔ صرف تنہا۔ اسکا قلم کھاتوں پر دوڑتا رہا۔ کھاتے پُر ہوتے رہے اور تبدیل ہوتے گئے ــــــ اُسکی آنتیں اندر ہی اندر گلتی چلی گئیں۔ جسم سوکھتا چلا گیا۔ لہو جلتا رہا۔ وہ پیلا ہوتا رہا ــــــ اور ایک دن وہ دِق کے گہرے غار میں جا گرا۔ اُسے ٹی۔بی ہو گئی .... لیکن وہ کھاتے لکھتا رہا۔ کیونکہ مجبور تھا۔ وہ فرم سے علیحدہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وہ سرکاری نوکری کے قابل نہیں تھا ــــــ نہیں ــــــ وہ قابل تھا ــــــ وہ قابل تھا ــــــ اور سرکاری دفتروں کے اکاؤنٹس کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی۔ کوئی ڈپلوما نہیں تھا۔ جسکے ذریعہ اُسے سرکاری نوکری ملتی۔ دوسرے اُسکی عمر کافی گذر چکی تھی .... اس لئے وہ اسی جوتے کی پرائیویٹ فرم کے کونہ میں بیٹھا رہا۔ اور کھاتوں پر اندراج کرتا رہا۔ اس کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا۔

دِق بڑھتی رہی۔ چراغ کا تیل کم ہوتا رہا اور روشنی مدھم پڑتی گئی۔

جولائی کی پہلی تاریخ تھی۔

وہ فرم کے گوشہ میں بیٹھا بِل بنا رہا تھا۔ آج اُس کے مُرجھائے اور پیلے بُشرے

پر کچھ تازگی تھی۔ کیونکہ آج تنخواہ کا دن تھا اُسکا قلم تیز تیز چل رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ایک نوجوان فرم میں داخل ہوا۔ اُس نے اپنی اُداس اور ویران آنکھیں اُٹھا کر نوجوان کو دیکھا۔ اُسکا دل دھک سے ہو گیا اور لاشعوری طور پر اندر ہی اندر بیٹھنے لگا۔ نا معلوم کیوں۔ دل کی یہ ڈوبتی دھڑکنیں کس خطرے کا پیش خیمہ ہیں۔ کون سا طوفان اُٹھنے والا ہے۔ کون سا بھیانک حادثہ رونما ہونے والا ہے۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ اور پھر لکھنے میں مشغول ہو گیا۔

مالک فرم نے اُسے اپنے پاس بلایا۔

نہال صاحب۔ یہ لیجئے اپنی تنخواہ" مالک بولا" اور ہاں۔ اب آپ گھر پر آرام کریں تو بہتر ہے کیونکہ یہ وقت آرام ہی کا ہے۔ کل سے آپ کی جگہ یہ کام کرینگے۔"

مالک نے نوجوان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

معاً اس کا دل ڈوب گیا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ گیا۔ اور اس کے ذہن پر ہتھوڑے سے پڑنے لگے اُسے کھانسی زور زور سے اُٹھنے لگی۔ لیکن وہ پھر بھی بولا۔

"سیٹھ جی! ابھی میں کام کر سکتا ہوں۔ بالکل اچھی طرح۔ بالکل ٹھیک۔"

"نہیں اب آپ آرام ہی کریں۔ کھاتوں میں بہت غلطیاں ہونے لگی ہیں۔"

وہ مالک کے رُعب سے خاموش رہا۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن وہ کہنا چاہتا تھا کہ میرا کیا ہوگا؟ میرے بیوی بچوں کا کیا ہوگا۔ وہ کیا کھائیں گے۔ وہ

بھوکے مر جائیں گے۔ کیونکہ یہ تنخواہ آج ہی ختم ہو جائے گی۔ میں مقروض ہوں —— مقروض —— قرضدار۔ تمام مہینہ اُدھار لے کر کھایا ہے —— لیکن وہ یہ سب باتیں کہہ نہ سکا۔ کیونکہ مالک فرم کچھ سُننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کھانستا ہوا وہاں سے واپس آ گیا اور اپنے کونہ میں بیٹھ گیا۔

وہ بیٹھا رہا اور نا معلوم کیا کیا سوچتا رہا۔ یکایک اُس کی نگاہ کھاتوں پر گئی، اور دو آنسو اُسکی آنکھوں سے ٹپک کر اُن پر گر گئے۔

"کاش! اے سیٹھ کے کھاتوں تم اتنی جلدی میرا خون نہ چوستے"۔ جیسے اسکی رُوح بول رہی ہو۔ "کاش! تم ابھی میری آنتیں نہ گلاتے۔ کاش تم ابھی مجھے دق کے غاروں میں نہ ڈھکیلتے تو تمہارا سیٹھ ابھی مجھے ملازمت سے علیحدہ نہیں کر سکتا تھا۔ اور میرے بچّے پل جاتے"۔

اس کے اشک گرتے رہے، کھاتے خاموش ڈیکس پر پڑے تھے۔ اُس نے پھر نو وارد نوجوان کو دیکھا۔ اس میں نیا خون تھا۔ نیا جوش تھا۔ نئی جوانی تھی۔ سڈول جسم تھا۔ چہرے پر رونق تھی۔ اور اُسکی آنتیں مضبوط تھیں۔

"لو اب تازہ خوراک آ گئی ہے۔ اِسے بھی کھوکھلا کر ڈالو"۔

اور وہ کھاتوں پر ہاتھ رکھتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اور زور زور سے کھانستا ہوا فرم سے باہر نکل گیا۔

کچھ دن بعد وہ پھر فرم کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اُسکی دِق آخری اسٹیج پر تھی۔ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ چہرہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ وہ کئی دن سے بھوکا تھا۔ اس کی بیوی اور بچے بھی بھوکے تھے۔ اُس نے سیٹھ جی سے پاؤ بھر آٹے کے پیسوں کی بھیک مانگی۔ لیکن سیٹھ جی نے دھتکار دیا۔ اُس کے اٹنک جاری ہو گئے کھانسی اُٹھنے لگی اور کچھ دیر بعد اُس نے فرش پر خون تھوک دیا۔

اُس نے سامنے دیکھا۔ آج فرم کے کونے میں ایک کمزور آدمی بیٹھا تھا لاغر۔ دُبلا پتلا۔ یہ وہی خوبصورت نوجوان تھا جو اس کے بعد فرم میں محرری کے لئے رکھا گیا تھا۔

وہ قہقہہ مار کر ہنس دیا پھیکا۔ بے جان اور کمزور سا قہقہہ۔ اس کے قہقہہ کی گونج میں ایک آواز تڑپ رہی تھی۔

"کیا پرائیویٹ ملازموں کا یہی انجام ہے"

وہ ہنستا رہا۔ پاگلوں کی طرح۔ دیوانوں کی طرح۔ جیسے وہ نہیں۔ بلکہ اُسکی موت قہقہے لگا رہی ہے۔ جیسے دیپک آخری بار جل کر ہمیشہ کے لئے بجھ جانا چاہتا ہے۔ اور وہ فرم کے سامنے دھڑام سے گر گیا۔ ایک مُرجھائے پھول کی طرح۔ ایک ٹوٹی شاخ کی طرح۔

اور شوز مارکیٹ کی تمام بجلیاں گُل ہو گئیں۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ موت کا سا بھیانک اندھیرا۔

وہ خونی تھا۔

گذشتہ سال۔

ایک رات۔

وہ تنہا کوٹھی میں تھا۔ اور کمرے میں بے تاب پھر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک جوان عورت اندر داخل ہوئی۔ سہمی ہوئی۔ لجائی ہوئی اور شرمائی ہوئی سی۔ جیسے کسی مجبوری نے اُسے کمرے میں دھکیل دیا ہو۔

وہ یہاں دن میں کھانا بناتی تھی۔

وہ مِس رانی تھی۔

اُسکی نوکرانی۔ اور وہ اُس کا مالک۔ اُسی کے حکم سے وہ اسوقت آئی تھی۔

"اب کیسی ہے تیرے پتی اور بچے کی حالت؟" اس نے پوچھا۔

"بہت خراب۔ ابھی تک بیہوش پڑے ہیں۔ دونوں بوکھار میں جل رہے ہیں"

"کیا بیماری ہے اُنھیں؟"

"ابھی تک کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھایا۔ پیسے ہی نہیں"

"میں نے تجھے پیسے دینے کے لئے ہی بلایا ہے" وہ بولا

اور اسکو سانس تیز تیز آنے لگا۔

بلب بجھ گیا

دروازہ بند ہوگیا

اور کمرے میں چار برہنہ ٹانگیں حرکت کرنے لگیں

مجبوری ہنس رہی تھی۔

ساری دنیا سو رہی تھی۔

اور اس دلسوز منظر کو صرف چند بے زبان تارے ہی دیکھ سکے وہ کھڑکی کے سامنے چمک رہے تھے۔ ان کے آنسو نکل آئے۔ اور تمام رات شبنم گرتی رہی

مس رانی کے پتی اور بچے کا علاج ہونے لگا۔ وہ صحت کی سبز وادیوں کی طرف آنے لگے۔ لیکن وہ خود موت کے تاریک غاروں کی طرف بڑھنے لگی۔ روز بروز مُرجھانے لگی۔

ایک پھول کی طرح۔

ایک درخت کی طرح۔

اُس کا شوہر تندرست ہوگیا۔ بچہ صحت یاب ہوگیا۔ لیکن وہ مر گئی۔

پھول مرجھا کر شاخ سے گر گیا۔

درخت سُوکھ کر بے جان ہوگیا۔

نامعلوم کیوں؟

صدمہ

رنج

غم

وہ اِس راز کو جانتا تھا۔ اسی لئے اپنے کو خونی سمجھتا تھا۔ اُس کے یہاں اب دوسری مِس رانی کھانا پکاتی تھی۔ پہلی سے کہیں زیادہ حسین، خوبصورت اور دلکش لیکن وہ اُسے آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔

وہ ظالم بھی تھا۔

پچھلے دِنوں

اُس نے ظلم کئے تھے۔ ان مزدوروں پر جو اُس کے مِل میں کام کرتے تھے۔ اُن سے دن رات کام لیا۔ لیکن اوورٹائم کا ایک پیسہ بھی نہ دیا۔ وہ لاغر ہوگئے۔ منہ سے خون تھوکنے لگے۔ ان کی بھوکی آنتیں گل گئیں۔ لیکن اُس کے جال سے رہا نہ ہو سکے مجبور تھے۔ شب و روز کام کرتے رہے۔ خون تھوکتے رہے اُن کی آنتیں گلتی رہیں۔

اور کچھ دن بعد۔

ان میں سے کئی مر گئے۔
کیڑوں کی طرح
ان کے بیوی بچے لاوارث ہو گئے۔
در در بھیک مانگنے لگے۔
چوکیداروں کی گالیاں سننے لگے۔
ایک دن۔
اُسکی کوٹھی کے چوکیدار نے بھی ایک فقیرنی اور اُس کے دو بچوں کو دھکا دیا تھا
وہ باہر سڑک پر جاکر گرے تھے۔ ان کے سروں میں چوٹ آئی تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا۔
بھائی۔ بہن کو مار رہا تھا۔ مزدور۔ مزدور کو مار رہا تھا۔
فقیرنی اُٹھی۔ اپنے بچوں کو سینے سے لگایا اور ہچکیاں لیتے ہوئے چوکیدار سے بولی۔
"یہ بچے اُسی کے ہیں۔ جس نے اپنی محنت سے تیرے سیٹھ کی تجوریاں بھری ہیں۔ اب تو اُنھیں دھرتی پر پھینک رہا ہے"
یہ کہکر وہ بچوں کو لے کر چلی گئی تھی۔
لیکن اسکی آنکھوں کے آگے سے پردے ہٹ گئے تھے۔ دبیز۔ موٹے۔ اور سیاہ پردے۔
اب وہ مزدوروں پر ظلم نہیں کرتا تھا۔ وہ بے ایمان بھی تھا۔
اُس کے مِل میں تیل نکلتا تھا۔
سرسوں کا۔

مونگ پھلی کا۔

السی کا۔

نچلا طبقہ تیل کھاتا تھا۔ اُس نے تیلوں میں زبردست ملاوٹ کی تھی۔ لوگوں کے چہرے پیلے پڑ گئے تھے۔ بدن کمزور ہو گئے تھے۔ وہ بیمار رہنے لگے تھے۔ ہزاروں دِق کے چنگل میں پھنس چکے تھے اور سیکڑوں مر گئے تھے۔

اس کے ایک وفادار نوکر کو بھی دِق ہو گئی تھی۔ اُسے وجہ معلوم تھی۔ لیکن خاموش تھا۔ اُس نے نوکر کو علیحدہ کر دیا۔

کچھ دن بعد

نوکر مر گیا

اُسے بہت احساس ہوا اور پھر کبھی اُس نے ملاوٹ نہیں کی۔

وہ چور بھی تھا

وہ کبھی بِل کے اکاؤنٹس صحیح نہیں رکھتا تھا۔

ہمیشہ گورنمنٹ کی بڑی بڑی چوریاں کرتا تھا۔

کبھی انکم ٹیکس کی

کبھی سیل ٹیکس کی

لیکن اب نہیں

وہ بلیک میلر بھی تھا

لیکن پہلے

اب وہ مسں رانی کی طرح کسی کا خون نہیں کرتا۔ مزدوروں پر ظلم نہیں ڈھاتا۔ تیلوں میں گندی ملاوٹ نہیں کرتا۔ اور نہ ہی بلیک میلنگ کرتا۔ لیکن اب تک وہ اپنے آپ کو خونی۔ ظالم۔ بے رحم۔ بے ایمان اور بلیک میلر سمجھتا۔ وہ خود کو ایک گنہگار گردانتا۔ ایک پاپی۔ کیونکہ پچھلے گناہ اور لغزشیں برچھیاں بن کر اُس کے دل میں پیوست ہو گئی تھیں اُسکی روح پر سیاہ دھبے پڑ گئے تھے اُسکا ضمیر ہر وقت چیختا رہتا تھا۔

تم خونی ہو۔

ظالم ہو۔

بے ایمان ہو۔

اُس کا قلبی سکون بالکل مفقود ہو چکا تھا۔ وہ سکون چاہتا تھا۔ من کی شانتی لیکن اُسکو سکون نہیں ملتا۔ ہر وقت پریشان۔ افسردہ اور اُداس رہتا۔ اُس کا بشرہ پیلا ہو گیا تھا۔

بے نور

بے رونق

پژمردہ

اُسے راتوں کو نیند نہیں آتی۔

اب بھی وہ ایک گدیلی مسہری پر لیٹا تھا۔ رات کے تین بج چکے تھے لیکن اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ سونا چاہتا تھا لیکن سو نہ سکا۔ اُس کا سارا جسم پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ آنکھوں پر ورم سی آ گئی تھی۔ اُس کے سر کے سیاہ و سفید بال خشک ہو گئے تھے۔ وہ بار بار مسہری پر ہاتھ پاؤں پٹک رہا تھا۔ کبھی کبھی اپنی ویران آنکھوں سے

میز پر رکھی دوا کی شیشیاں دیکھ لیتا تھا۔ شیشیاں خالی تھیں۔ وہ کروٹیں بدلنے لگا۔ آج وہ بہت زیادہ تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ اُس کا ضمیر متواتر چیخ رہا تھا۔

وہ مسہری سے اُٹھا۔ اور کھڑکی کے قریب آکر باہر دیکھنے لگا۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سڑکوں کے کنارے بجلیاں اس طرح جل رہی تھیں جیسے کسی نے کہکشاں کی کوئی لڑی توڑ کر لٹکا دی ہو۔ ہر شے نیند کی گداز گود میں پڑی سو رہی تھی

خاموشی

شانتی

سکوت

وہ من میں ایسی ہی شانتی چاہتا تھا۔ بالکل ایسی ہی۔ اور نیند بھی۔

لیکن محروم تھا۔

وہ بہت دیر تک کھڑکی کے پاس کھڑا رہا

گھڑی کی سوئیاں ڈائل پر رینگتی رہیں۔

رات ڈھلتی گئی۔

تارے پھیکے ہوتے گئے۔

اور ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔

یکایک مندروں کے گھنٹے بجنے لگے۔ مجیروں کی جھنکار۔ مردنگ کی چوٹ اور سنکھوں کی آوازیں خاموش فضائیں گونجنے لگیں۔

وہ ان آوازوں کو سنتا رہا

وہ ابھی تک کسی مندر میں نہیں گیا تھا۔ البتہ بچپن میں سن چکا تھا کہ بھگوان بڑے

دیالو ہیں۔ سب کے دُکھ دُور کرتے ہیں۔ پاپیوں کو چھما کرتے ہیں۔ اُس کے ذہن میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں اور وہ بے اختیار کمرے سے باہر نکل گیا۔

سڑک سنسان تھی۔

اُس کے قدم خود بہ خود اُٹھ رہے تھے۔ وہ دوڑ رہا تھا۔

گھنٹوں، سنکھوں اور مجیروں کی آوازیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

وہ ایک طرف مڑا اور سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔

آوازیں اور تیز ہو گئیں۔

وہ ایک پتھر کے بنے دروازے میں گھس گیا۔

اور کچھ دیر بعد وہ شیو کی مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ دوسرے پجاری بھی سر جھکائے اور ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ مورتی کے سامنے کھڑا مہا پجاری سنسکرت کے اشلوک پڑھ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں جو مکھی چراغ تھا۔ اور وہ اُسے مورتی کے چاروں طرف گھما رہا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ سے گھنٹی بجا رہا تھا۔

سب پُوجا میں مگن تھے۔

آرتی اُتر گئی

پرساد تقسیم ہوا۔

سب نے لیا۔ اور چلے گئے

وہ بھی مندر سے باہر آیا اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے سینہ میں دہکتے

شعلے بجھ گئے ہوں۔ آگ ٹھنڈی ہوگئی ہو۔ اور سوزش کم ہوگئی ہو۔ اس کے دل میں چبھی برچھیاں نکل گئی ہوں۔ زخموں پر ٹھنڈا ٹھنڈا مرہم لگا ہو اور جیسے اسکی رُوح کے سیاہ دھبے دُھل گئے ہوں۔

کچھ سکون
کچھ شانتی
کچھ خاموشی
کچھ آرام

اُس کے ہاتھ میں بھی پرساد تھا۔ اور وہ آہستہ آہستہ کوٹھی کیطرف جا رہا تھا۔

آفتاب نمودار ہو چکا تھا۔

اُس نے ایک مندر بنوا دیا
ایک کنوآں کُھدوا دیا۔
کئی پیاؤیں کُھلوا دیں
بیوہ خانوں۔ یتیم خانوں، اسکولوں اور اسپتالوں میں دان دیئے
گیتا اور رامائن کے پاٹ کرائے
برہمنوں کو بھوجن کرایا۔
.... اور بھگوان خوش ہو گئے۔........

اب وہ اپنے کو گنہگار نہیں سمجھتا۔ خونی۔ ظالم اور بے ایمان نہیں گردانتا۔ اُسکا

ضمیر خاموش ہو گیا تھا اور اُسے قلبی سکون حاصل ہو گیا تھا وہ خوش ، شاد تھا ، مسرور تھا ۔ اُس کے پژمردہ چہرے پر رونق آ گئی تھی ۔ آنکھیں چمکنے لگی تھیں ۔ اور سفید بال خضاب کی سیاہی سے کالے ہو گئے تھے .... اب وہ اسطرح زندگی کی روش پر دوڑ رہا تھا جیسے اُس نے کچھ کیا ہی نہیں تھا ۔

اور کچھ دن بعد

ایک رات

دوسری مس رانی اُس کے کمرے میں تھی .... چار برہنہ ٹانگیں ۔

مزدور اُس کے مِل میں کام کر رہے تھے ۔ لاغر ۔ کمزور اور بیمار مزدور

تیل میں گندی ملاوٹ ہو رہی تھی ۔

مِل کے اکاؤنٹس میں کالا جھالا کیا جا رہا تھا ۔

ٹرک اسمگلنگ کا مال تہ خانوں میں اُتار رہے تھے ۔

.... اور اوپر آکاش میں پھیکے پھیکے تارے ٹمٹما رہے تھے جیسے بھگوان کی طرف دیکھکر رو رہے ہوں

اُس رات شبنم بہت گری تھی ۔
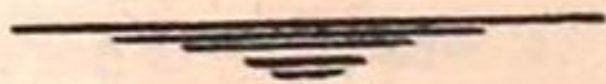
شاہکار

اندھیری رات تھی۔

ساری دُنیا سو رہی تھی۔

لیکن شاعر جاگ رہا تھا۔ اور اُس کے تخیئل کے نیلے اُفق پر آہستہ آہستہ سنہری آفتاب اُبھر رہا تھا۔ ہرے بھرے چمن میں کلیاں چٹک رہی تھیں، خوش الحان طیور گا رہے تھے سِتار کے تار جھنجھنا رہے تھے اور شاعر پر ایک کیف طاری ہو رہا تھا۔ اور وہ کہہ رہا تھا ؎

پورب کے گلابی ساگر میں سورج کا سفینہ بہتا ہے
پُر کیف ہوائیں چلتی ہیں اور سویرا ہوتا ہے
کلیوں کے نازک ہونٹ کھلے۔ مرغانِ چمن بھی گانے لگے
نرگس کی نشیلی آنکھ سے اب نیند کا پردہ ہٹتا ہے

دُنیا سوتی رہی۔

شاعر جاگتا رہا۔

اور اس کی تصوّر میں ایک سہانی صبح نے جنم لیا۔ ایک ہرا بھرا باغ مہکا۔ ہوائیں چلیں۔ پھول کھلے۔ پھولوں میں دو پھول مخصوص تھے، دو پھول ۔۔ یا ۔۔ دو روحیں ۔۔ جو کل سب کے روبرو ایک دوسرے کی ہو جائیں گی اور شاعر نے کہہ دیا ؎

مخمور ہوا کے جھونکوں کے رنگین سے آنچل ہلتے ہیں
گلشن میں لچکتی شاخوں پر دو پھول خوشی کے کھلتے ہیں
اک ڈور میں باندھیں جاتی ہیں دو انجانی روحیں باہم
جیون کے نئے دوراہے پر انجان سے ساتھی ملتے ہیں

اس کے بعد اس کے خیالوں کے چکنے فرش پر گورے گورے پاؤں ناچنے لگے۔ طبلہ بجنے لگا۔ پائل جھنکنے لگی، در و دیوار پر چراغ جل اٹھے اور خوبصورت دو شہزادوں کے نقرئی قہقہے بلند ہو گئے۔ سب خوش تھے۔ سب جھوم رہے تھے، شاعر نے پھر کہا ؎

شہنائی بجی پائل جھنکی رمستی میں باجے بجتے ہیں
سازوں سے سجی اس محفل میں خوشیوں کے دیپک جلتے ہیں
اوشا، بینا، اندرا، وینا آج بہت مسرور سی ہیں
کیوں نہ خوشی میں وہ جھومیں بھائی جو دولہا بنتے ہیں

اور پھر اس کی کلپنا کے وسیع میدان میں ایک شاندار بارات گھومنے لگی۔ باجے بجنے لگے۔ شہنائیاں گونجنے لگیں۔ اوپر نیلا آسمان جھک آیا اور وہاں سے گیندے کے پھول برسنے لگے گویا جنتی روحیں اس پر نثار ہو رہی تھیں۔ شاعر نے پھر کہا ؎

سورگیہ اشور داس نے بھی جنت سے لیشپ لٹائے ہیں

سور گیہ چندر کور نے بھی کلیوں کے ہار بنائے ہیں
سور گیہ لکھمی داس نے بھی جنت سے گل برسائے ہیں
ہم پھول کی بارش میں ساتھی بارات سجا کر لائے ہیں

.... اور اس کے بعد سہرا مکمل ہو گیا۔ شاعر کے تصورات کے مہکتے گلشن میں خزاں آگئی۔ جذبات اور وجدان کے روشن چراغ گل ہو گئے۔ اور اس کے ذہن کی جگمگاتی محفل میں اندھیرہ چھا گیا۔ اندھیرہ، خوفناک اندھیرا۔

اور اُدھر مشرق میں اُجالا پھیل گیا۔ دن نکل آیا۔ دنیا جاگ اُٹھی، غم جاگ اُٹھے خوشیاں جاگ اُٹھیں۔ شاعر کی دُبلی۔ پتلی اور فاقہ زدہ بیوی جاگ اُٹھی۔ اُس کا نو سالہ بیمار بچہ جاگ اُٹھا۔ اور اُس کے چہرے اور بدن کے پیپ بھرے کالے اور موٹے دانے جاگ اُٹھے، دانوں کی سوزش جاگ اُٹھی۔ جلن جاگ اُٹھی ——— اور بچہ رونے لگا۔ شاعر تڑپ اُٹھا کیونکہ وہ بچے کا باپ تھا۔ اور وہ بچہ اُسے عزیز تھا وہ اُس کے پاس آیا اور اُسے بہلانے لگا لیکن بچہ روتا رہا۔ ماں سے نہ دیکھا گیا اور وہ بول ہی پڑی۔

"آج اس کے لئے آپ دوا ضرور لائیے"

"ہاں آج دوا ضرور لاؤں گا۔"

شاعر نے پھر کہا ——— "آج میں میرٹھ جا رہا ہوں۔ ایک بارات کے ساتھ، وہاں سہرا پڑھنا ہے۔ وہاں جو روپیہ ملیں گے ان میں سے دوا ضرور لاؤں گا"

یہ کہہ کر شاعر سفر کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

اُسکی بیوی مطمئن ہو گئی۔ ماں کی ممتا کو سکون مل گیا۔

دس بج چکے تھے۔

شاعر اسٹیشن پر آیا۔ اُس کا دل کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ اُسکی آنکھیں رات بھر جاگنے سے بوجھ سی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ کچھ کھا کر بھی نہیں آیا تھا۔ پلیٹ فارم پر خوب چہل پہل تھی۔ اسپیشل ٹرین تیار تھی۔ باراتی سوار ہو چکے تھے۔ ایک شخص شاعر کے پاس آیا اور اُسے ایک کمپارٹمنٹ میں لے گیا۔ کمپارٹمنٹ میں سیٹھ دین دیال اُن کا لڑکا جسکی یہ بارات تھی اور کچھ معزز حضرات بیٹھے تھے۔ ایک برتھ پر ہندی کے کوی کلدیپ جی بھی بیٹھے تھے۔ ان سے بھی ہندی میں سہرا لکھنے کے لئے کہا گیا تھا۔ شاعر جوں ہی کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ کسی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ارے واہ۔ شاعر بھائی بھی آ گئے۔ اب خوب سفر کٹے گا۔"

کسی نے سرگوشی کے لہجہ میں اپنے ساتھی سے کہا۔ "شہر کے مشہور شاعر ہیں"

کسی نے کہا — "پڑھتے بھی خوب ہیں۔"

شاعر سب آوازیں سن رہا تھا لیکن خاموش تھا۔ اُس نے نگاہیں اُٹھا کر صرف کلدیپ جی کو دیکھا۔ کلدیپ جی نے شاعر کو — اُردو نے ہندی کو۔ ہندی نے اُردو کو۔ اور کلدیپ جی کے بشرے پر عجیب سے نقوش اُبھر آئے۔ گویا شاعر کا آنا اُنہیں ناگوار گذرا ہو۔ شاعر اسی کے متعلق سوچنے لگا۔ ٹرین چلنے لگی اور اس کے پہیوں کے ساتھ شاعر کا ذہن بھی گھومنے لگا .... یہ کیسے فنکار ہیں؟ جو فنکار ہوتے ہوئے فنکار سے نفرت کرتے ہیں۔ فن کو بدنام کرتے ہیں اور فنکار کے شیشے کی طرح صاف اور بھید بھاؤ سے پاک دل پر سیاہ داغ لگاتے ہیں۔ اس کلدیپ کے دل میں نفرت کی آگ کیوں بھڑکی۔؟ اسلئے کہ میں شاعر ہوں اور وہ کوی۔ میں اُردو سے تعلق رکھتا ہوں

اور وہ ہندی ہے ـــــــ اُردو ـ ہندی ـــــــ ہندی اُردو ـــــــ نہیں ـ نہیں ـ ان زبانوں کی وجہ سے فنکار ـ فنکار کا دشمن نہیں ہو سکتا ـــــــ انسان ـ انسان کا دشمن نہیں ہو سکتا ـــــــ تو پھر، اسلئے کہ میں مسلمان ہوں اور وہ ہندو ـــــــ لیکن فنکار کا دل تعصب سے پاک ہوتا ہے اس کے نزدیک کل انسان ایک ہوتے ہیں ـ اس کا فن سب کے لئے ہوتا ہے ـ اُسکا پیغام ایک ہوتا ہے ـــــــ پھر کلدیپ کے چہرے پر نفرت کے نقوش کیوں اُبھرے ـ کیا وہ کلا کار نہیں ؟؟؟ ـــــــ شاعر سر جھکائے سوچتا رہا ـ

ٹرین کے پہیوں کی گردش تیز ہوتی رہی ـ

" کیا سوچ رہے ہو شاعر ؟ " ـــــــ سیٹھ دین دیال کی آواز سے شاعر چونک گیا ـ

" کچھ نہیں "

" تو پھر کچھ شروع ہو جائے ـ سب لوگ سننے کے لئے بیقرار ہیں "

شاعر مجبور تھا ـ وہ سیٹھ جی کا حکم نہیں ٹال سکتا تھا ـ کیونکہ سہرہ پڑھنے کے لئے سیٹھ جی ہی اُسے میرٹھ لے جا رہے تھے اور انہوں نے ہی اُسے پچاس روپے دینے کا وعدہ کیا تھا ـــــــ اور شاعر کی سوکھی زبان سے شعر نکلنے لگے ـ ـــــــ کمپارٹمنٹ میں اُسکی آواز پھیلنے لگی ـ سب خوش تھے ـ لیکن شاعر جیسے سب کے درمیان بیٹھا آگ میں جل رہا ہو ـ

گاڑی تیز ہوتی جا رہی تھی ـ شاعر کی آواز بھی تیز ہوتی جا رہی تھی ـ

جب کوئی اسٹیشن آتا ـ ٹرین رکتی ـ شور و غل ہوتا ـ اور شاعر خاموش ہو جاتا

گاڑی چلتی، شور و غل کم ہوتا۔ اور شاعر پھر کوئی غزل سنانے لگتا۔ اسیطرح اسٹیشن آتے رہے اور گذرتے رہے۔ گاڑی رکتی رہی اور چلتی رہی اور پرآکاش میں سورج کا رتھ بھی متواتر پچھم کی طرف بڑھتا رہا۔ گھڑیوں کی سوئیاں ڈائل پر رینگتی رہیں، وقت گذرتا رہا ——— اور شام ہو گئی۔

ٹرین کی رفتار مدھم ہوئی۔ اور وہ آہستہ آہستہ میرٹھ کے اسٹیشن پر آکر رک گئی ——— شاعر خاموش ہو گیا۔ دن بھر چیختے چیختے اُسکی آواز بیٹھ گئی تھی۔ کلدیپ جی نے بھی اپنی نظمیں سنائی تھیں، لیکن بہت کم۔

تمام باراتی خوش خوش پلیٹ فارم پر اترے۔ شور و غل ہونے لگا۔ باجے بجنے لگے۔ اور سب کے بشروں پر شادمانی رقص کرنے لگی۔ لیکن شاعر کا چہرہ اُداس ہو گیا کیونکہ تکان کمزوری اور غم کی آہنی ضربوں نے اُس کا جسم چور چور کر دیا تھا۔ اُس کی آنکھیں کچھ اندر کو دھنس گئی تھیں۔ رنگ پیلا ہو گیا تھا اور اُسکا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

بارات اسٹیشن سے روانہ ہوئی اور ایک وسیع پنڈال میں آکر ٹھہر گئی۔

کچھ دیر بعد منڈپ میں آگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔

شہنائیاں بجنے لگیں۔

پنڈت کے منہ سے سنسکرت کے اشلوک نکلنے لگے۔ دولہا، دلہن آگ کا طواف کرنے لگے۔ اور اُن کا رشتہ مضبوط ہونے لگا۔ سب خاموش بیٹھے تھے اور ان دو اجنبی النازل کو دیکھ رہے تھے۔ جو زندگی کی پُر پیچ راہ طے کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے عہد و پیمان کر رہے تھے۔

آہستہ آہستہ نندیپ کی آگ ہلکی ہوگئی۔

شہنائیوں کی آواز بند ہوگئی ——— اور سماج کی یہ رسم بھی پوری ہوگئی۔

سیٹھ دین دیال ایک دم کھڑے ہوگئے اور فرطِ مسرت سے چیخے۔

"آیئے شاعر صاحب۔ سہرا پڑھئے۔"

شاعر بہت ہی نڈھال ہوچکا تھا۔ وہ شرابی کی طرح لڑکھڑاتا ہوا منڈپ کے قریب آیا اور سہرا پڑھنے لگا ——— لیکن اُسکی آواز بیٹھ چکی تھی۔ اُس کے منہ سے الفاظ اٹک اٹک کر نکل رہے تھے۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آسمان کے تمام تارے ٹوٹ کر اُسکی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے ہوں۔ اُسے کاغذ پر کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ خاموش ہوگیا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ بیٹھی ہوئی آواز سے پڑھنے لگے۔ سہرے کے اشعار اچھے تھے لیکن وہ لوگوں کو متاثر نہ کرسکے اور سب نے ملکر ایک طنزیہ قہقہہ بلند کردیا۔ اُس نے پوری قوت سے سہرا پڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ اُس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ گلا پھول گیا۔ قہقہے اور بلند ہوگئے کلدیپ جی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی ——— لیکن سیٹھ دین دیال کے تیور بدل گئے اُنھیں غصہ آگیا۔ وہ مجبور تھے۔ ورنہ شاعر کا منہ نوچ لیتے۔ اتنا بے اثر سہرا لکھ کر لایا ہے۔ گیا میرے پچاس روپے حرام کے ہیں اور وہ غصہ کی آگ میں جلتے رہے ———

شاعر کو ایسا معلوم ہوا جیسے اسکی منزل قریب آکے گم ہوگئی ہو۔ سہرا ختم ہوگیا۔ اور اسکی آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی دبیز چادر پھیل گئی اُس کا سر چکرانے لگا۔ پاؤں کانپنے لگے۔ تمام جسم ٹھنڈا ہوگیا۔ اور وہ چکرا کر وہیں گر پڑا۔

سب گھبرا گئے۔

لیکن کسی نے کہا ــــ" ارے یار شاعر ہے۔ شراب زیادہ پی لی ہوگی"
"نہیں یار۔ محبوب یاد آگیا ہوگا۔ فرقت کی تاب نہ لا سکا"
اور اس کے بعد پھر فلک شگاف قہقہے بلند ہوگئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔
سیٹھ جی کے حکم کے مطابق ایک نوکر نے شاعر کو کندھے پر اٹھایا اور پنڈال کے ایک کونہ میں ڈال دیا۔ اس کے بعد کلدیپ جی نے سہرا پڑھا۔ داد اور انعام دونوں ہی ملے۔ وہ بہت خوش تھے جیسے جس داد اور تعریف کی وجہ سے دو فنکار آپس میں ببر رہتے ہیں وہ کلدیپ جی کو مل گئی ہے۔
رات زیادہ ہوگئی تھی۔ اسلئے سب کی آنکھوں میں نیند کا خمار انگڑائیاں لے رہا تھا اور کچھ دیر بعد سب سو گئے۔ شاعر بھی پنڈال کے ایک کونہ میں اس طرح بیہوش پڑا تھا جیسے کوئی افریقہ کا زر خرید حبشی کسی انگریز کے لہلہاتے کھیت میں تھکا ماندہ پڑا ہو۔

آکاش کے نیل میں ستاروں کے جگمگاتے کنول آہستہ آہستہ ڈوب گئے۔ شفق کی لال پری پوربی کنارے پر نہانے کے لئے اتر آئی۔ عطر بیز ہوائیں سرسرانے لگیں صحن گلشن میں بہاروں کے مہکتے ہوئے گیت گونجنے لگے۔ فضا میں چڑیوں کے پُر کیف نغموں نے ایک نشہ سا گھول دیا۔ کچھ دیر بعد یہ حسین منظر دیکھنے کے لئے آفتاب بھی آسمانی پردوں سے باہر نکل آیا ــــ اور صبح ہوگئی۔
دنیا جاگ اٹھی۔

شاعر جاگ اُٹھا۔ وہ کچھ سکون محسوس کر رہا تھا۔ کچھ قوت سی۔ جیسے رات کے واقعہ سے وہ قطعی بے خبر ہے لیکن کچھ دیر بعد اُسے خیال آیا۔ رات کو اُس نے مہرا پڑھا تھا ——— لیکن انعام ——— وہ پچاس روپیہ ——— اُس کا ہاتھ بے اختیار جیب میں چلا گیا۔ جیب خالی تھی۔ وہ گھبرا سا گیا۔ اور سیٹھ جی کو تلاش کرنے لگا۔ ناشتہ کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ سب براتی کرسیوں پر آ کر بیٹھ چکے تھے۔ اور ناشتہ کر رہے تھے لیکن اسوقت سیٹھ جی ناشتہ پر موجود نہ تھے۔ یہ دیکھ کر شاعر بوکھلا سا گیا۔

"بھائی اسوقت سیٹھ جی کہاں ہیں" ——— اُس نے ایک نوکر سے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم" ——— اُس نے بے رُخی سے جواب دیا جیسے اُسے شاعروں سے نفرت ہو۔ شاعر اُداس ہو گیا۔

کچھ دیر بعد اُسے سیٹھ جی کئی آدمیوں کے ساتھ آتے نظر آئے۔ اُس نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ اُنہوں نے بے رُخی سے جواب دیا اور دوسروں سے باتیں کرنے لگے وہ سر جھکائے اُن کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دولت کے پیچھے علم و فن سر جھکائے آ رہے ہوں۔

"رات کو آپ نے اتنی پی لی کہ ہوش و حواس بھی کھو بیٹھے" ——— سیٹھ جی نے شاعر سے کہا ——— "اور صاحب جتنی توقع آپ کے سہرے سے تھی اتنا اچھا نہیں رہا ——— خیر یہ لیجئے اپنے پیسے"۔

اور شاعر نے پچاس روپیہ لے لئے اُسے کچھ خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ایسی دو ندیوں کے سنگم کے درمیان تیر رہا ہے جہاں ایک ندی کا پانی برف کی طرح صاف اور ٹھنڈا ہے اور دوسری کا میلا اور گرم۔

"شکریہ" ——— وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

سیٹھ جی چلے گئے۔

کچھ دیر بعد بارات وداع ہوگئی

ٹرین چل دی

اسٹیشن آئے اور گذر گئے

وقت بیت گیا۔

اور گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ فورٹ پر آکر رک گئی۔ شام ہونے والی تھی پلیٹ فارم پر بہت سے لوگ موجود تھے۔ خوب چہل پہل تھی۔ عورتوں نے دلہن کو اُتارا اور گلے سے لگالیا باجے پھر بجنے لگے۔

شاعر بھی اپنے کمپارٹمنٹ سے اُترا۔ اور سب سے پہلے پلیٹ فارم سے باہر آگیا۔ اُس نے ایک ڈاکٹر سے اپنے بچے کے لئے دوا خریدی۔ اور پھر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اُس کے قدم تیز تیز اُٹھ رہے تھے۔ جب وہ اپنے گھر میں داخل ہوا۔ سورج غروب ہوچکا تھا۔ ہر طرف اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مکان کی یہ ویرانی دیکھ کر اس کا دل دھک سے ہوگیا۔

"ستارہ"

اُس نے بے اختیار بیوی کو پکارا۔ لیکن خاموشی۔ صرف اُسے ہچکیاں سُنائی دیں۔

"ستارہ کیا مرا بیٹا مر گیا" ——— وہ چیخا۔ اور دوا کی شیشی زمین پر گر کر چور چور ہوگئی ——— "میں نے تو اسکی صورت بھی نہیں دیکھی۔ میں نے تو اُسے پیار بھی نہیں کیا۔

کیا میں اُسے اپنے ہاتھوں زمین کو بھی نہ سونپ سکا۔

"ہاں۔ وہ آپ کے جاتے ہی اللہ کو پیارا ہوگیا"___ ستارہ ہچکیوں کے درمیان صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ یہ سنکر اُس کا سر چکرا گیا۔ اُسے اپنے گرد تاریکیاں گھومتی نظر آئیں۔ اپنا گھر گھومتا نظر آیا۔ اور وہ سر پکڑ کر ایک خستہ سی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ بیٹھا رہا۔ بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ معاً اُس کے تاریک ذہن میں برقی قمقموں سے جگمگاتی سیٹھ جی کی کوٹھی اُبھر آئی۔ جہاں شبِ عروسی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ جہاں قہقہے بکھر رہے تھے ___ ہائے یہ دنیا ___ اور اُسکی پلکوں سے دو آنسو ٹپک گئے۔ رات اور تاریک ہوگئی۔

اُس کے وجدان میں طوفان آگیا

اُس کا احساس جاگ اُٹھا۔

شبنم رونے لگی۔

تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔

اور وہ بیٹھا رہا۔

اور جب صبح نے انگڑائی لی تو اُس نے ایک کاغذ پر اپنے جذبات بکھیر دیئے۔ اپنے جذبات۔ ایک نظم۔ جسکا عنوان "اولاد" تھا۔ اولاد۔ اُس کا شاہکار۔

"اولاد۔ میرا شاہکار"

وہ اپنی سوکھی زبان سے صرف اتنا کہہ سکا۔ اور اسکی آنکھوں میں پھر آنسوؤں کا طوفان اُمنڈ آیا۔ اور وہ بے سُدھ ہو کر ڈھیلی ڈھالی چارپائی پر

لڑھک گیا۔ اُسکی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن آنسو بہہ رہے تھے گویا شاہکار کی تخلیق کی دشواریوں سے زمانہ کو آگاہ کر رہے ہوں۔ یکایک اُس کے اشکوں کی قطار بند ہوگئی۔

اور اس کا کاغذ اُس کا شاہکار ہوا نے اُٹھا کر زمین میں پھینکدیا۔
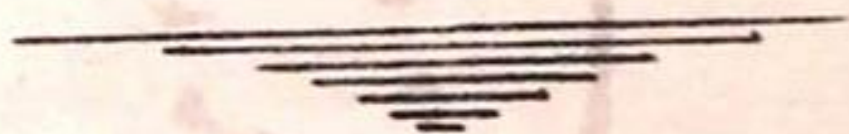
منّا کو اندھیرا پسند تھا۔

اندھیرہ

وہ اندھیرہ جو عصمت فروش عورتوں کے بے نور، نفرت آمیز اور مُردہ چہروں کو چھپا کر حسین ترین بنا دیتا ہے۔ اُن کے غلیظ اور مریل جسم کے ڈھانچے پر دبیز چادر ڈال کر گداز کر دیتا ہے۔ جس کی سرپرستی میں جرائم پرورش پاتے ہیں اور جو حقیقتوں کو اپنی سیاہ آغوش میں سُلا لیتا ہے۔ اندھیرہ جسقدر گہرا ہوتا ہے، منّا اتنا ہی سکون محسوس کرتا ہے اور وہ اطمینان سے اپنا کام انجام دیتا ہے اُسے چاندنی راتوں سے نفرت تھی۔ جب چاندنی رات ہوتی اُسے ایسا معلوم ہوتا گویا چاند کی روپہلی کرنیں سفید سانپ بن کر فضا میں پھنکاریں مارتی پھر رہی ہوں چاروں طرف زہر ہی زہر پھیلا ہوا اور موت اُس کے آس پاس منڈلا رہی ہو۔ اِسی لئے وہ چاندنی راتوں میں اپنا کام ہوشیاری سے کرتا تھا۔ ساون کی اندھیری راتیں

اُسے عزیز تھیں۔ جب چاروں طرف گھنگھور بادل اُمنڈ آتے۔ بجلی چمکتی بھیگی بھیگی
سرد ہوا چلتی اور ٹھنڈا پانی برستا تو اُس کے گاہکوں میں اضافہ ہوجاتا اور وہ
اُنہیں گرمی سپلائی کرتا۔ ہلکی ہلکی آنچ۔ کیونکہ وہ سپلائر تھا۔ اُس گرمی کا۔ اُس
ہلکی ہلکی آنچ کا جو عورت کے گرم اور گداز جسم میں ہوتی ہے اور یہ کام وہ رات
کے اندھیرے میں کرتا تھا۔

جب آفتاب اپنی تیز شعاعیں سمیٹ کر مغربی غاروں میں اُتر جاتا۔ اُس
وقت منّا جونس کالج کی چار دیواری پر آکر بیٹھ جاتا اور اپنی بے نور اور دھنسی
دھنسی آنکھوں سے سامنے ویران سی سڑک پر دیکھنے لگتا۔ اُسکا کوئی گاہک آتا
اُسے جگہ بتاتا اور چلا جاتا۔ وہ بھی دیوار پر سے اُٹھ کر جاتا اور کچھ دیر بعد ایک
عورت کو رکشا میں بٹھا کر وہاں پہونچا دیتا۔ کمرے کے کواڑ بند ہوجاتے اور وہ باہر
ایک طرف کھڑا ہوکر بیڑی پینے لگتا۔ تھوڑی دیر بعد وہ عورت تھکی تھکی سی
باہر آتی اور رکشہ میں بیٹھ جاتی۔ وہ اُسے گھر پہونچا دیتا اور پھر جونس کالج
کی دیوار پر آکر بیٹھ جاتا اور سامنے سنسان سی سڑک پر دیکھنے لگتا۔

وہ اس دیوار پر کافی رات تک بیٹھا رہتا اور گداز اور ملائم ملائم جسم
سپلائی کرتا رہتا۔ اُن عورتوں کے گداز اور ملائم ملائم جسم جو سیدھے سادے اور
غریب شوہر کی باوفا بیویاں ہوتیں۔ اُن کنواری لڑکیوں کے جسم جو کسی نادار باپ کی بیٹیاں
ہوتیں۔ اُن مجبور دوشیزاؤں کے جسم جو اُس کے چالاک جنگل میں پھنسی ہوتیں۔ اور
اُن خوشحال حسیناؤں کے جسم جو امیر شوہر کی بظاہر فرمانبردار بیویاں بھی ہوتیں
اور سوسائٹی میں عزت کی نظر سے بھی دیکھی جاتیں —— یہ سب پیاسی عورتیں منّا

کے ذریعہ اپنی پیاس بجھاتیں۔ کسی کو جنسی پیاس تھی۔ کسی کو زر کی۔ منا سب کی پیاس بجھاتا۔ اور اس کے عوض اسے جو کچھ ملتا۔ اس سے اپنی بیوی اور اپنے دو بچوں کا پیٹ پالتا۔

منا نے اتنی عزتوں کو لٹتے ہوئے دیکھا تھا کہ اس کے دل میں کسی کی بھی عزت نہیں رہی تھی۔ وہ کسی کو اپنا بڑا نہیں مانتا تھا۔ کسی کی ہدایت پر عمل نہیں کرتا تھا۔ وہ وہی کرتا تھا جو وہ چاہتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ساگر کا احترام کرتا تھا۔ ساگر جو ایک رقاص تھا۔ اس کے گھنگھریالے بال بڑھے ہوئے تھے۔ جسم تندرست اور توانا تھا۔ وہ اکثر سفید دھوتی اور کرتہ پہنے رہتا تھا۔ منا نے اس سے دوستی اس غرض سے بڑھائی تھی کہ وہ اس حسین لڑکی کو بھی رقص سکھایا کرتا تھا۔ جس کے ساتھ ایک رات گذارنے کے لئے اس کے ایک رئیس گاہک نے ڈھائی ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ منا کئی رقاصوں کے ذریعہ اس قسم کا کام انجام دے چکا تھا۔ اس نے اس خوبصورت لڑکی پر بھی ساگر کی آڑ لے کر اپنا جال پھینکا۔ ساگر نے دیکھ لیا۔ اسے معلوم تھا کہ اسکا دوست اتنا نیچ ہے۔ اتنا ذلیل ہے۔ اسکا یہ پیشہ ہے۔ لیکن خاموش تھا اور اب اس کے بدن میں آگ لگ گئی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ غصہ کی وجہ سے اس کے پاؤں کانپنے لگے۔ اس کے ہاتھ منا کا گلا گھونٹنے کے لئے بے چین ہو گئے۔ اور اسکی یہ حالت دیکھ کر منا سہم گیا۔ ساگر نے اپنی اس حالت پر قابو پانے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ وہ غصہ میں اندھا ہو چکا تھا۔ اسے سانس تیز تیز آ رہا تھا اس نے کمرے کے ایک کونہ میں سے ترشول اٹھایا اور چیخا۔

"سروج۔ طبلہ بجاؤ"

اور یہ کہہ کر وہ تانڈو رقص کرنے لگا اُس کے پاؤں تیزی سے ناچنے لگے۔ بدن بجلی کی طرح تڑپنے لگا، چہرہ آگ کی طرح سُرخ ہوگیا آنکھوں سے چنگاریاں سی اُڑنے لگیں، ترشول فضا میں چکّر کاٹنے لگا اور سروج خوفزدہ سی طبلہ بجانے لگی۔ وہ حیرت سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اور وہ ایک تیز بگولے کی طرح ناچ رہا تھا۔ گویا سارے جہاں کو تہ و بالا کردے گا۔ منّا سہما ہوا اُسے دیکھ رہا تھا .... سروج تیزی سے طبلہ بجاتی رہی۔ اور وہ ہوا میں رکھے چراغ کی لَو کی طرح ناچتا رہا۔ بہت دیر تک ناچتا رہا اور پھر اس کی آنکھیں غیر ارادی طور پر بند ہوگئیں اُسے ایسا معلوم ہوا گویا اُس کے ساتھ ساری دنیا چکّر کاٹ رہی ہے، چاند ستارے ٹوٹ رہے ہیں۔ سورج کا گولہ پھٹ گیا ہے۔ آسمانوں میں بھونچال آگیا ہے۔ سمندر میں اونچی اونچی لہریں چنگھاڑ رہی رہی ہیں۔ چاروں طرف موت کی خوفناک چیخیں گونج رہی ہیں اور یہ دنیا تباہ ہو رہی ہے۔ یہ دنیا جہاں انسان مرچکا ہے۔ لیکن شیطان زندہ ہے، جہاں انسانیت مرچکی ہے۔ لیکن شیطانیت زندہ ہے، جہاں درندے زندہ ہیں جانور زندہ ہیں۔ منّا زندہ ہے۔ منّا کے گاہک زندہ ہیں۔ ......

دھڑام

اور وہ زور سے فرش پر گر گیا! ۔ اور اس "پرلے" میں سب فنا ہوگئے۔

"ماسٹرجی"

سروج ایک دم چیخ پڑی۔ اور اُس کے قریب آگئی۔ منّا بھی ڈرتا ڈرتا اُس کے پاس آیا۔ وہ بیہوش ہو چکا تھا اور اُس کے ہاتھ میں سے ترشول چھُوٹ چُکا تھا۔ سروج جلدی سے ایک گلاس میں پانی لے آئی اور اُس کے منہ پر تھوڑا سا چھڑک دیا۔ کچھ دیر بعد آہستہ آہستہ اُس نے آنکھیں کھولدیں اور وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ ہر شے اپنی جگہ موجود تھی۔ منّا بھی ——— سروج بھی۔ اور سروج کے بلاؤز میں منّا کا دیا ہوا وہ پرچہ بھی جو اُس نے ساگر سے نظر بچا کر سروج کو دیا تھا۔ لیکن اُس نے دیکھ لیا تھا۔

"سروج لاؤ وہ پرچہ مجھے دو۔"

اور سروج کے ہاتھ سے پانی کا گلاس گر گیا۔ اُس کے ذہن پر ایک تھوڑا سا لگا۔ اُس نے نگاہ اُٹھا کر ایک دفعہ منّا کو دیکھا اور پھر اسکی گردن حیا سے جھک گئی۔ اُس نے وہ پرچہ بلاؤز میں سے نکال کر اُسے دے دیا

"تم جاؤ۔ آج شکھا نہیں ہوگی۔"

اور سروج اس کے اس چھوٹے سے کلا کنج میں سے چلی گئی۔ منّا سمجھنے لگا کہ اب ساگر اُسے اپنے غصہ کی آگ میں بھسم کر دیگا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کیونکہ ابھی ابھی ساگر اپنے غصہ کے شعلوں میں خود جل چکا تھا۔ اور اُس کا غصّہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اُس نے آہستہ سے پوچھا۔

"سروج نے یہ پرچہ پڑھا تو نہیں؟"

"نہیں" ——— منّا بامشکل تمام اتنا کہہ سکا۔

"منّا تمہارے اس ذلیل پیشے کے متعلق مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا"
ساگر نے پھر کہا۔ "لیکن میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ تم اس ذلیل پیشے کی دلدل میں سروج کو بھی دھکیلنے کی کوشش کرو گے۔ تم میرے دوست ہو۔ اسلئے وہ تمہاری عزت کرتی ہے اور تم اس کی اس مروّت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہو"
ساگر کہہ رہا تھا۔ اور منّا سر جھکائے سن رہا تھا۔

"منّا تم نہیں جانتے کہ تم اس پیشے کو اختیار کر کے کتنا بڑا پاپ کر رہے ہو۔ تمہارا یہ پاپ مجھے تم سے نفرت کرنے پر آمادہ کر رہا ہے لیکن نہیں۔ میں گناہ سے نفرت کرتا ہوں۔ گنہگار سے نہیں۔ تم گنہگار ہو۔ میرے دوست ہو مجھے تم سے اب بھی محبت ہے۔ لیکن تمہارے گناہ سے نفرت۔ اس لئے بھگوان کے لئے تم یہ پیشہ چھوڑ دو۔"

یہ سنکر منّا نے اپنی آنکھیں اٹھا کر حیرت سے ساگر کو دیکھا۔ اسکے بشرے سے التجا ٹپک رہی تھی اور منّا کے دل میں اسکی عزت کا ایک تیر پیوست ہو گیا۔ وہ وہاں سے اٹھا۔ اور خاموشی سے چلا آیا۔

لیکن اس نے اپنا وہ ذلیل پیشہ نہیں چھوڑا۔

اس واقعہ کے بعد سروج ساگر کے پاس رقص سیکھنے نہیں آئی۔

وہ روز اس کا انتظار کرتا۔ اس کے لئے زمین سجاتا۔ طبلہ ٹھیک کرتا گھنگھرو صحیح کر کے رکھتا۔ لیکن وہ نہیں آتی۔ اور وہ مایوس ہو جاتا۔ اس کے قدم خود بخود زمین پر ہولے ہولے ناچنے لگتے۔ ایک ایسا ناچ جسمیں انتظار ہی انتظار ہوتا

اور جس میں انتظار کی حالت کی عکاسی ہوتی۔ اُسکی متلاشی آنکھیں، چہرہ پر یاس اور آس کے ملے جُلے تاثرات۔ ہونٹوں پر خشکی اور سینہ میں دھڑکتا دل یہ سب اُس کے جذبات کی ترجمانی کرتے۔ وہ کافی دیر تک انتظار رہتا۔ لیکن سروج نہیں آتی.......کافی دن گذر گئے۔

ایک دن اُس نے یہی ناچ ایک اسٹیج پر کیا تھا۔ لوگوں نے بہت پسند کیا۔ اور اُسے دیش کا بہترین رقاص مانا۔ اور اُسے ایک خطاب بھی دیا سب خوش تھے۔ فضا میں تالیوں کی آوازیں گونج رہی تھیں لیکن وہ خاموش تھا۔ کیونکہ اُس کے تصوّر میں سروج ناچ رہی تھی اس کے باوجود اس نے سب کا شکریہ ادا کیا۔

اُس کے رقص کے بعد کافی رات تک مختلف قسم کے پروگرام پیش کئے گئے۔ وہ خاموشی سے اُنہیں دیکھتا رہا۔ تقریباً گیارہ بجے جب وہ گھر واپس آرہا تھا تو اُس نے جونس کالج روڈ پر ایک رکشہ میں منّا کو دیکھا۔ وہ کہیں جارہا تھا۔ اُس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔

"منّا"

ساگر نے آواز دی

لیکن رکشا نہیں رکا۔

اُس نے ایک مرتبہ پھر پکارا

لیکن رکشا چلتا رہا

اُس نے جلدی جلدی قدم بڑھائے اور رکشا کے قریب آکر رکشا والے

سے گرجدار آواز میں رکشا روکنے کے لئے کہا۔ اور رکشا رک گیا۔ وہ آگے بڑھا ابھی وہ منّا سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ یکایک اس کی نگاہ منّا کے قریب بیٹھی سروج پر گئی۔

دھائیں

جیسے آسمان پھٹ گیا۔

جیسے زمین شق ہو گئی۔

اور وہ چکرا سا گیا۔ پہلے کی طرح ایک مرتبہ پھر اُسکی نگاہوں میں ساری کائنات گھوم گئی۔ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ گویا اس اذیت کُن منظر نے اس کی قوتِ گویائی سلب کر لی ہو۔ وہ رکشا سے الگ ہٹ گیا۔ اور رکشا آہستہ آہستہ سروج کا تازہ جسم لے کر اندھیرے کی طرف بڑھنے لگا۔

اس نے اپنی ویران آنکھیں اُٹھا کر رکشا کو دیکھا۔

رکشا متواتر آگے بڑھ رہا تھا۔

"منّا"۔۔۔

وہ پھر بے اختیار چیخا۔ جیسے اُس کے ذہن کے چاروں طرف کھڑکیاں کھُل گئی ہوں اور پھر تیزی سے بھاگ کر رکشا کا ہینڈل پکڑ لیا۔ رکشا رُک گیا۔

"منّا۔ سروج کو کہاں لے جا رہے ہو"

وہ گرجا۔

منّا خاموش رہا۔ اُس کی اس خاموشی سے ساگر کا غصہ اور بڑھ گیا اُسے سانس تیز تیز آنے لگا۔ چہرہ تمتما گیا۔

"میں جانتا ہوں، تم اسے کہاں لے جا رہے ہو۔ بے شرم"

اور اتنا کہکر اُس نے منّا کے گال پر ایک زوردار طمانچہ مار دیا۔ منّا تڑپ گیا اور اُس نے بے اختیار ساگر کا گریبان پکڑ کر جیب سے چاقو نکال لیا۔ اُس کے سینے میں غصّہ کی آگ دہک چکی تھی۔ یہ دیکھ کر ساگر سہم گیا۔ سروج، جو شرم سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ بے اختیار چیخی۔

"منّا۔"

اور منّا نے ساگر کا گریبان چھوڑ دیا۔ گویا اپنی اس حرکت پر خود نادم ہو رہا تھا۔ پھر آگے بڑھ گیا۔

ساگر کچھ دیر اُس سنسان سڑک پر کھڑا رہا اور اس کے بعد وہ بھی گردن جھکائے آگے بڑھ گیا۔

اگلے روز شام کو ساگر تنہا کمرے میں اُداس بیٹھا تھا۔ اُس کے سامنے نٹ راج کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ آج وہ کہیں بھی رقص سکھلانے نہیں گیا تھا۔ اور نا ہی اُس نے ان لڑکیوں کو تعلیم دی تھی جو اُس کے پاس سیکھنے یہاں آتی تھیں۔ اُس نے اُن سے کہدیا تھا کہ آج اسکی طبیعت خراب ہے۔ آج اُس کے بہت سے مدّاح بھی مبارکباد پیش کرنے آئے تھے اور انہوں نے اسے اس نئے خطاب سے مخاطب کیا تھا جو اُسے کل شام ملا تھا۔ لیکن وہ اُن سے معمولی رسماً گفتگو کرتا اور خاموش ہو جاتا تھا۔ اور وہ لوگ مایوس ہو کر چلے جاتے تھے۔

کچھ دیر بعد منّا افسردہ سا کمرے میں داخل ہوا۔ ساگر نے کچھ سراسیمگی سے

اُسے دیکھا۔ منا اُس کے قریب آیا اور نرم لہجہ میں بولا۔

"میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں ساگر۔ کل مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی تھی۔ جب میں نے چاقو نکالا تھا تو یقین کرو مجھے کچھ ہوش نہیں تھا"

"معافی" ساگر نے کہا۔ "معافی تو مجھے تم سے مانگنی چاہئے کہ بلا وجہ میں تمہارے اور سروج کے درمیان بولا"

"شرمندہ نہ کرو ساگر۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ سروج تمہاری ہے"

"میری سروج"

ساگر ہنس دیا۔

"ہاں۔ تمہاری سروج۔ وہ اب بھی تمہاری ہے" منا نے پھر کہا ——

"وہ ویسی ہی ہے۔ جیسے پہلے تھی۔ کل کے واقعہ سے میری آنکھیں کھل گئی ہیں ساگر۔ میں اپنے دوست کی پاک چیز کو ہرگز ناپاک نہیں کر سکتا تھا۔ اس دوست کی چیز جو گناہ سے نفرت کرتا ہے اور گنہگار سے پیار۔ جو مجھ سے محبت کرتا ہے اور میرے پیشے سے نفرت —— اب تک میں نا معلوم کتنے محبت بھرے دلوں کو توڑ چکا ہوں۔ کتنی محبتوں کو نفرت میں بدل چکا ہوں۔ نہ جانے کتنے لوگوں کو دھوکہ دے چکا ہوں۔ اپنے ان گناہوں کا احساس کل مجھے ہوا تھا۔ اور اسی وقت سے مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی تھی۔ اپنی زندگی کو ذلیل سمجھنے لگا تھا۔ اپنی ہر چیز کو حقیر سمجھنے لگا تھا۔ اور اسی عالم میں میں نے اپنے اس گندے پیشے کو ترک کر دیا تھا۔ اور سروج کو واپس گھر پہونچا دیا تھا"

"منا" —— ساگر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اور اُسے گلے سے لگا لیا

— "تم نے اپنا پیشہ ترک کر کے نامعلوم کتنے لوگوں پر احسان کیا ہے"۔

یہ جملہ سنکر مُنّا "طنزاً" مسکرایا اور بولا۔

"احسان — میں نے کسی پر احسان نہیں کیا ساگر۔ بلکہ میں نے ان بیویوں پر ظلم کیا ہے جن کے شوہر بیکار اور محتاج ہیں۔ جنکا دنیا میں کوئی نہیں۔ ان کے یہاں اب فاقے ہوں گے۔ میں نے ان بال بیواؤں پر ظلم کیا ہے جو شادی سے پہلے ہی بیوہ ہو چکی ہیں اور جنھیں سماج حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہے اور میں نے ایسے مردوں کی بیویوں پر ظلم کیا ہے جو اُن کے قابل ہرگز نہیں ہیں۔ لیکن اپنی اس کمزوری کو ظاہر بھی نہیں ہونے دیتے"۔

یہ سنکر ساگر چونک سا گیا اور کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

"تم گنہگاروں کی مدد کرتے تھے مُنّا۔ ان پر کوئی احسان نہیں کرتے تھے"۔

"گنہگار" — مُنّا بولا — "کون گنہگار — ؟ — بے کار اور محتاج شوہر کی بیویاں گنہگار۔ بال بیوائیں گنہگار۔ ایسے مردوں کی بیویاں گنہگار جو مرد نہیں —"

"ہاں" — ساگر نے کہا — "ہر وہ شخص گنہگار جو بُرا کام کرتا ہے یا اُسے کرنے کی دوسروں کو ترغیب دیتا ہے۔ بے کار اور محتاج شوہر کی بیویاں کسی اچھے گھرانے کی خادمہ بھی تو بن سکتی ہیں۔ بال بیوائیں اپنے اس ظلم کے خلاف بغاوت کر کے سماج کی آنکھیں بھی تو کھول سکتی ہیں۔ بیویاں ایسے مردوں کو ٹھکرا بھی تو سکتی ہیں جو مرد نہیں۔ یا پھر یہ سب اُس انسانی جذبہ کو استعمال کر سکتی ہیں جس میں ایثار اور قربانی شامل ہے یہ سب ایسے گندے گناہ کر کے انسانیت کی

فضا کو متعفن بناتے ہیں۔ کیا تم ایسی گندی اور بدبودار فضا میں سانس لینا گوارا کروگے"؟——

"مجبوری انسان کو مجبور کردیتی ہے"—— منّا پھر بولا——"سروج بھی مجبور ہو کر یہ گندہ گناہ کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ ساگر تمہیں معلوم ہے اس کے پتا پوسٹ آفس میں پوسٹ ماسٹر تھے۔ لیکن جب سے وہ مرکزی سرکاری ملازمین کی ہڑتال میں شریک ہوئے ہیں۔ ان پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ ان کی نوکری چھوٹ چکی ہے۔ اخراجات وہی ہیں۔ بلکہ بے کاری کے سبب اور بڑھ گئے ہیں۔ مجبور ہو کر انہوں نے اپنے دو بچوں کو اسکول سے ہٹا لیا ہے۔ سروج بھی اس سال بی۔ اے کے امتحان میں شریک نہیں ہو سکتی ہے۔ کیونکہ فیس کے لئے پیسے ہی نہیں۔ ادھر میں اس کو اپنے لیس بیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے یہ موقعہ غنیمت سمجھا اور اس سے فائدہ اُٹھایا۔ اس کا نتیجہ تم نے کل رات دیکھ لیا۔ کہ وہ میرے ساتھ رکشا میں بیٹھی تھی"

منّا جذبات کی رَو میں کہہ گیا۔

ساگر گم ہو گیا۔ اُس کے ذہن میں مجبور ولاچار سروج پھر اُبھر آئی وہ اُس کے متعلق سوچنے لگا۔ اور منّا وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔

اگلے دن ساگر سب سے پہلے ایک شوز فیکٹری میں گیا۔ وہاں اس کا ایک دوست منیجر تھا۔ وہ اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ لیکن اس کی افسردہ صورت دیکھ کر اُسے حیرت بھی ہوئی اور اُس نے پوچھا۔

"یہ تم نے کیا حال بنا رکھا ہے۔ خیریت تو ہے۔"

"ہاں سب ٹھیک ہے۔" یہ کہکر ساگر کرسی پر بیٹھ گیا۔ "میں تم سے یہ دریافت کرنے آیا ہوں سدیش کہ تمہاری فیکٹری میں کسی کلرک کی جگہ خالی ہے یا نہیں۔"

"کیوں۔ کیا نرت کلا چھوڑ کر یہ کام کرنے کا ارادہ ہے"

"نہیں۔ میرا ارادہ تو نہیں۔ لیکن ایک دوسرے صاحب ہیں۔ وہ ایک پوسٹ آفس میں پوسٹ ماسٹر بھی رہ چکے ہیں۔ کافی تجربے کار ہیں۔ لیکن ہڑتال میں حصہ لینے کی وجہ سے انکی سروس ختم ہو گئی ہے۔ آجکل بہت پریشان ہیں۔"

"نہیں بھئی۔ اگر تم اپنے لئے سروس چاہتے ہو تو میں کوشش کر سکتا ہوں کسی اور کے لئے نہیں۔" سدیش نے مسکرا کہا۔

"نہیں سدیش۔ تمہیں یہ کام کرنا ہی ہوگا۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو ایک خاندان کی عزت تباہ ہو جائے گی۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں۔" ساگر نے التجا آمیز لہجہ میں کہا۔

یہ سنکر سدیش پھر مسکرا کر بولا —— "میری جان۔ تم کسی کام کو کہو اور میں نہ کروں۔ تم ان صاحب کو یہاں بھیجدو۔ انہیں سروس مل جائے گی۔ میں بوس سے انکی سفارش کردوں گا۔ آجکل مال روس کو بہت زیادہ سپلائی ہو رہا ہے۔ ہمیں تجربہ کار کلرکوں کی ضرورت بھی ہے۔"

سدیش کے یہ جملے سنکر ساگر کی ویران آنکھوں میں چمک سی آگئی اور وہ فرطِ مسرت سے بے اختیار بولا۔

"میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا سدیش۔"

"اچھا، اچھا۔ اب آپ میری خوشامد نہ کیجئے بلکہ یہ بتائیے کہ آپ چائے پئیں گے یا کوکا کولا"

"اسوقت کچھ نہیں۔ میں جاکر ان صاحب کو یہاں بھیجتا ہوں پھر کبھی آؤنگا"
اور ساگر شدیش کے بے حد اصرار پر بھی نہیں رکا اور وہاں سے چلا گیا۔

وہ سروج کے مکان پر آیا۔
سروج اُسے دیکھ کر سہم گئی۔ اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اُس کے پتا۔ جن کے بشرے سے پریشانی صاف عیاں ہو رہی تھی۔ نے اُسے کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا اور خود بھی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔
"آجکل سروج شکچھا کیلئے نہیں آرہی ہے" ساگر نے کرسی پر بیٹھتے ہی پوچھا
"ہاں۔ آجکل میں کچھ ایسی پریشانیوں میں مبتلا ہوں، جنکی وجہ سے میں نے ہی اُسے نرت سیکھنے کے لئے منع کر دیا ہے"
یہ سُنکر ساگر چونک سا گیا۔ اور اس نے پھر پوچھا
"ایسی کون سی اُلجھنیں ہیں"
سروج کے پتا نے اپنی سروس سے علیحدہ ہونے کا تمام واقعہ سُنا دیا۔
"آجکل پیراڈائس شوز فیکٹری میں کلرکوں کی ضرورت ہے" ساگر نے بتایا۔
— "اگر آپ مناسب سمجھیں تو فی الحال وہاں سروس کر لیجئے"
"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں تیار ہوں"
ساگر نے اُنہیں پیراڈائس شوز فیکٹری کا پتہ نوٹ کرا دیا اور خود نیر سروج

سے ملے وہاں سے واپس آگیا۔

کافی دن بیت گئے

سروج کے پتا پیرا ڈائس شوز فیکٹری میں متواتر کام کر رہے تھے۔ ان کی پریشانیاں ختم ہو چکی تھیں۔ ان کے گھر میں مسرتوں کے چراغ پھر روشن ہو چکے تھے۔ خوشحالی پلٹ آئی تھی اس کے باوجود سروج ساگر کے پاس رقص سیکھنے نہیں آئی اور نا ہی وہ سروج کے گھر گیا۔ حالانکہ اُس کے دل میں محبت کی آگ اب بھی سُلگ رہی تھی۔ آج اُسے منا یاد آ رہا تھا۔ کیونکہ وہ ابھی جونس کالج کی اس چاردیواری کے قریب سے گزرا تھا۔ جہاں منا بیٹھتا تھا۔ منا۔ اُس کا گنہگار دوست۔ جواب انسان بن چکا تھا۔ جس کے اُس نے طمانچہ مارا تھا اور وہ فوراً سمجھ گیا تھا کہ ساگر سروج کو چاہتا ہے۔ سروج اُسکی ہے۔ سروج میرے دوست کی ہے اور اس نے ڈھائی ہزار روپیہ ٹھکرا دیئے۔ اپنی حسرتوں کا خون کر دیا تمناؤں کے چراغ گُل کر دیئے ——— نا معلوم وہ کیا کر رہا ہوگا۔ کیسا ہوگا۔ کس حال میں ہوگا بہت دن سے آیا نہیں۔

اور وہ آ رہا تھا۔ سامنے سڑک پر۔ سر جھکائے۔ اُداس، تھکا، تھکا۔ اُسے دیکھکر ساگر کو کچھ تعجب ہوا۔ وہ اُسی کے متعلق سوچتا ہوا جا رہا تھا۔ اور وہ آگیا۔

"منا کہاں ہو۔ آجکل آتے بھی نہیں" اُس نے آگے بڑھکر پوچھا۔

"اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا ہوں" منا نے مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا۔"

"کیا مطلب" ساگر نے پوچھا۔

"فاقے ۔۔۔ منا جل گیا ۔۔۔" اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ میرے بچے بھوکے مرینگے ۔ تو میں کبھی اپنا پیشہ ترک نہ کرتا ۔ میں عصمتیں فروش کرتا ۔ اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتا ۔ میں پہلے جرم کرتا تھا ۔ گناہ کرتا تھا ۔ پاپ کرتا تھا ۔ لیکن آج کی طرح بھوکا کبھی نہیں رہتا تھا ۔ میں اب بھی بھوکا رہ سکتا ہوں ، میری بیوی بھوکی رہ سکتی ہے ۔ لیکن میں بچوں کو بھوکا نہیں دیکھ سکتا ۔ اور اسلئے آج پھر چولس کالج کی چار دیواری پر جا رہا ہوں "

یہ کہہ کر وہ چل دیا ۔

" منا تم ہوش میں ہو " ساگر نے اُسے روک لیا ۔

" ہاں ۔ میں ہوش میں ہوں ۔ بالکل ہوش میں ۔ میں یہ جانتا ہوں کہ میں نے اپنا پیشہ ترک کرنے کا عہد کیا تھا ۔ میں یہ جانتا ہوں کہ میں نوکری کے لئے جس کے پاس گیا ۔ اُس نے مجھ سے نفرت کی ۔ میں نے مزدوری کی ۔ لیکن میرے ہاتھ پاؤں جواب دے گئے "

" میں تمہاری مدد کروں گا منا میں ۔ تم رک تو جاؤ "

لیکن منا نہیں رُکا ۔ سڑک کی دوسری جانب دو شخص آ رہے تھے ۔ وہ منا کو دیکھ کر اس کے پاس آ گئے ۔ ساگر بھی قریب آگیا ۔ منا نے انہیں دیکھ کر قہقہہ لگایا جیسے واقعی وہ اپنے ہوش وحواس کھو چکا ہے ۔۔۔ وہ چیخا ۔

" کہو ۔ پرآن آج مال پہنچاؤں ۔ رکا رُکا یا ہے "

ساگر کو غصہ آگیا ۔ اُن میں سے ایک نے کہا ۔

" ہاں ۔ ہم تو تمہیں کافی دن سے تلاش کر رہے ہیں ۔ گھر پہ بھی نہیں ملتے ۔ خیر ذرا جلدی کام کر دینا " ۔۔۔

اور وہ دونوں جانے لگے۔ منّا بھی آگے بڑھا۔

"منّا میں تمہیں نہیں جانے دونگا"

ساگر نے گرجدار آواز میں کہا۔ اور منّا کے دونوں گاہکوں نے سُن لیا وہ پلٹ آئے۔ ساگر نے پھر کہا۔ اور اس مرتبہ اُس کے سر میں ایک زوردار گھونسہ پڑا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ اُس نے پیچھے مڑکر دیکھا، دونوں کھڑے تھے۔

"بدمعاش، منّا کو روکتا ہے"۔۔۔۔ پران نے کہا۔ گویا وہ دونوں منّا کی حمایت لے رہے ہوں ۔۔۔ اور ساگر کے متواتر کئی گھونسے پڑے۔ اور وہ چکرا کر سڑک پر گر گیا۔

"پران"

منّا چیخا۔ اور اس نے بے اختیار اُس کے ایک گھونسہ مار دیا۔ وہ غصہ میں اندھا ہو چکا تھا۔ اس نے جب ساگر کو سڑک پر بیہوش پڑا دیکھا تو ایک زخمی شیر کی طرح بپھر کر چاقو نکال لیا۔ اور ان دونوں پر حملہ آور ہوا۔ منّا کے ہاتھ میں چاقو دیکھکر اُنہیں بھی غصہ آگیا۔ اور چاقو نکال لئے .... کچھ دیر بعد ایک چیخ فضا میں گونج گئی اور منّا لڑکھڑا کر سڑک پر گر گیا۔ اُسکی کمر میں سے خون نکل رہا تھا اس کے دونوں گراہک بھاگ گئے تھے۔

جب اُنہیں ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھے اُنکی بیڈوں کے قریب چند پولیس مین کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے ان سے دریافت کرکے رپورٹ درج کی اور

چلے گئے۔ منا کی کمر میں چاقو گہرا لگا تھا۔ وہ اوندھا پڑا تھا۔ اس کے زخم پر پٹی۔ بندھی تھی ساگر کے جبڑوں میں تکلیف تھی۔ اس کا سر بھی دکھ رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نرس نے منع کیا لیکن اس نے نرس سے کہدیا کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہے کافی آرام محسوس کر رہا ہے اور یہ کہکر وہ کمرے سے باہر نکل گیا

اگلے دن وہ پھر اسپتال میں آیا۔ وہ منا کے لئے کچھ فروٹ اور دودھ لایا تھا اس کے ساتھ منا کے دونوں بچے بھی تھے۔ انہیں دیکھکر منا کی ویران آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ اس کے پژمردہ چہرہ پر زندگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اسکی سوکھی رگوں میں خون دوڑنے لگا۔ گویا جو خیال کل اسے ساگر کے چلے جانے پر ہوا تھا۔ اسے آج اسکی آمد نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے۔

"تم کوئی فکر نہ کرو منا میں ان بچوں کی حفاظت کر رہا ہوں"

ساگر نے کہا

اور وہ انکی حفاظت کرتا رہا۔

دن گزرتے رہے

منا کا زخم بھرتا رہا

وہ اسپتال آتا رہا

منا کو تسلی دیتا رہا۔

اور ایک شام منا کا زخم بالکل بھر گیا۔ اسکی پٹی کھل گئی وہ بالکل ٹھیک ہو گیا۔ ساگر بہت خوش تھا۔ حالانکہ وہ خود بہت کمزور ہو گیا تھا۔ چہرہ پر ہلکی ہلکی پیلاہٹ پھیل گئی تھی۔ جسم کمزور ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس نے اپنی تکلیف کا مداوا نہیں کیا تھا۔ وہ منا کو

لے کر اسپتال کے گیٹ پر آیا۔ منا کو کچھ مریضوں سے ملنے میں دیر ہو گئی تھی۔ چاروں طرف بجلیاں جل چکی تھیں۔ شام آہستہ آہستہ رات کی حد میں۔ قدم رکھ رہی تھی۔ وہ سڑک پار کرنا چاہتے تھے کہ ایک طرف سے ایک شاندار بارات کا جلوس آ گیا۔ وہ دونوں رک گئے اور اسے دیکھنے لگے۔ دولہا کو دیکھ کر ساگر کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اسے کچھ حیرت بھی ہوئی۔ لیکن جب گھوڑے پر بیٹھے دولہا نے اسے گردن کے اشارے سے قریب بلایا تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ بارات اس کے دوست سدیش کی ہے۔ اس کا دوست سدیش جو بیراڈائس شوز فیکٹری میں منیجر ہے۔ وہ مسکراتا ہوا اسکے پاس گیا۔ منا بھی اس کے پیچھے تھا۔

"کیوں بے میری شادی میں کیوں نہیں آیا" ——— سدیش نے ساگر سے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ہی پوچھا۔

"یار۔ بے مجھے معلوم ہی نہ تھا۔ ورنہ میں ضرور آتا" ——— ساگر نے جواب دیا۔

"کیا انویٹیشن کارڈ نہیں ملا تھا"

"نہیں ——— تم نے کہاں بھیجا تھا"

"تمہارے گھر ———"

"اوہ یار ——— گھر تو میں کافی دن سے نہیں گیا آجکل اپنی بھابی کے یہاں رہ رہا ہوں" ——— ساگر نے مسکرا کر کہا۔

"بھابی" ——— سدیش نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"ہاں۔ ان کے یہاں" ——— ساگر نے منا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

سدیش نے منا کو دیکھا۔

"یار۔ یہ بتاؤ کہاں ہاتھ مارا ہے" ساگر نے پوچھا

"پورا واقعہ تو پھر بتاؤں گا۔ بارات رکی کھڑی ہے۔ اسوقت صرف اتنا سمجھ لو کہ تمہارے ذریعہ جو صاحب ہمارے فرم میں کلرک ہوئے تھے ان کی لڑکی سروج سے ——"

"سروج" —— ساگر کے منہ سے بے اختیار نکلا

"سروج" —— تمنا نے آہستہ سے کہا۔

دھڑام

ایک پٹاخہ پھٹا۔ اور بارات آگے بڑھ گئی

"کل ضرور آنا ساگر" —— سدیش نے چلتے ہوئے کہا۔

دھڑام ۔ دھڑام

ساگر کے ذہن میں سیکڑوں پٹاخے پھٹ گئے۔ اُس کے دماغ میں دھواں ہی دھواں گھُٹ گیا۔ اُس کے دل میں آگ لگ گئی۔ اُس کی پلکیں اور بھنویں جلنے لگیں۔ اس نے اپنی اس حالت پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اور بامشکل تمام آنکھیں کھولکر سامنے دیکھا سامنے ایک کار پھولوں سے سجی ہوئی جا رہی تھی اور اس میں دُلہن سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ساگر لڑکھڑا گیا۔ اُس نے بہت سنبھلنے کی کوشش کی۔ لیکن بے سُود اور وہ دھڑام سے سڑک پر گر گیا۔ تمنا فوراً اُس کے اوپر جھک گیا۔

بارات گذر گئی۔ جھاڑ فانوس گذر گئے۔ براتی نکل گئے اور وہ بیہوش پڑا رہا۔ تمنا نے پوری قوت سے اُسے اپنے کندھے پر اُٹھایا اور لڑکھڑاتا ہوا پھر اسپتال میں گھُس گیا۔

انار کلی

(ڈرامہ)

منظر

دوپہر کا وقت ہے۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔ سامنے افغانستان کی پہاڑیاں خاموش کھڑی ہیں۔ ان کے پیچھے دور۔ بہت دور آکاش زمین کے اوپر اسطرح جھک گیا ہے جیسے کسی کیف میں ڈوبی حسین دوشیزہ کے اوپر اسکا عاشق بیخود سا ہو کر جھک جاتا ہے دھوپ کے سائے آہستہ آہستہ رینگ رہے ہیں۔ اوپر چیلیں ایک دائرے میں دھیرے دھیرے پرواز کر رہی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی کوئی چیل دوسری چیل کے پیچھے تیزی سے دوڑنے لگتی ہے اور کافی دیر تک یہ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتی رہتی ہیں۔ اُنکی "چی چی" کی آواز اس خاموش فضا میں اسطرح اُبھرتی ہے۔ جیسے شب کی بھیانک ظلمتوں کے درمیان کوئی چراغ روشن ہو جاتا ہے اور اُس کے بعد وہ تاریکیاں حسین ترین معلوم ہونے لگتی ہیں

یہ وہ مقام ہے جہاں ہندوستان اور افغانستان کی سرحدیں ملتی ہیں۔
۱۵۹۹ء کا زمانہ ہے۔ زمین کے سینہ پر ایک پگڈنڈی دور تک چلی گئی ہے۔ پگڈنڈی کے اس طرف ہندوستان ہے اور دوسری طرف افغانستان جس جگہ سے افغانستان کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ وہاں ایک بورڈ لگا ہے اور اس پر جلی حرفوں میں افغانستان لکھا ہے۔ ہندوستان کی سرحد کے قریب ایک سُرنگ کا دروازہ ہے، پردہ جیسے ہی اُٹھتا ہے۔ تین عورتیں اس دروازے میں سے نکلتی ہے اور درمیان میں آکر ادھر اُدھر دیکھنے لگتی ہیں۔ ان خواتین میں ایک عورت بوڑھی ہے اور دو جوان العمر لڑکیاں۔ یہ دونوں بہت حسین و جمیل اور جاذب نظر ہیں۔ ان کے خوبصورت اور گول گول بدنوں پر شباب انگڑائیاں لے رہا ہے۔ ان کے پھول سے نازک اور گداز جسموں پر جوانی کی چاندنی چٹک رہی ہے، یہ دونوں خاموش ہیں۔ لیکن ایک بہت زیادہ اُداس اور مغموم معلوم ہوتی ہے۔ وہ بالکل چُپ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس پر سکتہ کا عالم طاری ہے۔ تکان اور گرد راہ سے ان دونوں کا حُسن اور نکھر گیا ہے لیکن بوڑھی عورت کی جھرّیاں پہلے سے زیادہ گہری ہو گئی ہیں۔ وہ اُداس اور مغموم دوشیزہ کو مخاطب کرکے کہتی ہے۔

بوڑھی عورت۔ انارکلی۔ بیٹی وہ دیکھو۔ افغانستان کی سرحد آگئی۔ اب ہم مغل اعظم اور شہنشاہ ہند اکبر کے حکم کے مطابق اس ہندوستان سے ہمیشہ کے لئے وہاں چلے

جائیں گے اور آرام سے زندگی بسر کرینگے۔

انارکلی خاموش رہتی ہے

وہ صرف اپنی خوبصورت گردن

اُٹھا کر ایک اُچٹتی نگاہ افغانستان

پر ڈالتی ہے۔

بوڑھی عورت ۔ بیٹی۔ تُو بولتی کیوں نہیں۔ تو نے شہنشاہ اکبر کے اس رحم و کرم کا بھی شکریہ ادا نہیں کیا۔ جو انہوں نے تیری اس بوڑھی ماں کی ممتا پر کیا ہے۔ اور تجھے اس سے بچا نہیں کیا۔ کیا تجھے میرا خیال نہیں۔

دوسری جوان لڑکی۔ ہاں۔ باجی۔ کچھ تو بولئے۔ لاہور سے یہاں تک ہم سُرنگ کے ذریعہ آئے لیکن آپ کچھ نہیں بولیں۔ خدا کے لئے اب پچھلی باتوں کو بھول جائیے۔ جو ہونا تھا ہوگیا۔ زمانہ تو یہ سمجھ رہا ہوگا کہ انارکلی زندہ دیوار میں چُنوادی گئی ہے اور اب وہ مرچکی ہوگی۔ صاحب عالم نے بھی یہی سمجھ لیا ہوگا۔

انارکلی ۔ (نہایت نحیف و کمزور آواز میں) صاحب عالم

دوسری جوان لڑکی۔ ہاں باجی۔ اب آپ بھی صبر کیجئے۔

انارکلی ۔ صبر۔ کتنا تو صبر کیا ہے ثریا۔

بوڑھی عورت ۔ چلو بیٹی ہم جلدی سے ہندوستان کی سرحد سے باہر نکل جائیں اور شام ہونے سے پہلے افغانستان میں داخل ہو جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ راستہ میں ہی رات ہو جائے اور ہم تمام شب خوفناک جنگلوں میں ہی بھٹکتے پھریں

ثریّا ۔ ہاں باجی جلدی چلئے

یہ کہکر وہ انارکلی کی کلائی پکڑ لیتی ہے۔ اور افغانستان کی سرحد کی طرف بڑھنے لگتی ہے ماں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی ہے۔ انارکلی کے قدم کچھ دور چلنے کے بعد خودبخود رک جاتے ہیں۔ وہ کھڑی ہو جاتی ہے اور پلٹ کر ہندوستان کی طرف دیکھتی ہے۔

ماں ۔ (جلدی سے) کیا ہوا بیٹی؟

ثریّا ۔ کیوں رک گئیں باجی؟

انارکلی ۔ ثریّا۔ افغانستان کی طرف جوں جوں قدم بڑھ رہے ہیں میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔

یہ سُن کر ماں بے چین ہو جاتی ہے۔ اور کہتی ہے۔

ماں ۔ گھبراؤ نہیں بیٹی۔ افغانستان میں داخل ہوتے ہی ہم آرام کرینگے۔ کئی دن کی تھکان سے تمہیں ایسا محسوس ہو رہا ہوگا۔

انارکلی ۔ نہیں ماں۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے ہندوستان نے میرے پاؤں پکڑ لئے ہیں۔ میرا دل اس سے باہر جانے کو نہیں چاہ رہا ہے۔ مجھے کوئی آواز دے رہا ہے۔ مجھے لاہور بُلا رہا ہے ماں۔ لاہور

ماں ۔ (بہت زیادہ غمگین ہوکر) ایسا نہ کہو بیٹی۔ ورنہ میرے دل میں بھی ہندوستان کی محبت جاگ جائے گی۔

انارکلی ۔ ماں مجھے سہارا دو۔ میں ہندوستان چھوڑ کر نہیں جا سکتی ۔

ماں ۔ میں شہنشاہ اکبر کو کیا جواب دونگی ۔

انارکلی ۔ میں لاہور بھی نہیں جاؤں گی ۔

ماں ۔ پھر کہاں جاؤگی میری بیٹی ۔

انارکلی ۔ کسی قریب کے گاؤں میں ، جہاں ہمیں کوئی پہچان نہیں سکے گا ۔

ماں ۔ نہیں انارکلی ۔ شہنشاہ کی آنکھیں بہت تیز ہیں اُن کے ہاتھ بہت لمبے ہیں ۔

ثریا ۔ (جلدی سے) باجی ۔ اب تو ہم بہت قریب آگئے ہیں ۔ چار پانچ قدم چلنے کے بعد افغانستان میں داخل ہو جائیں گے ۔

یہ کہکر وہ پھر انارکلی کی کلائی پکڑ لیتی ہے ۔

ماں ۔ (نہایت شیریں لہجہ میں) آؤ بیٹی چلو ۔

اور وہ بھی انارکلی کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیتی ہے اور آہستہ آہستہ یہ تینوں افغانستان کی سرحد کی طرف بڑھنا شروع کر دیتی ہیں ۔ انارکلی پیچھے مڑ مڑ کر ہندوستان کو دیکھتی جاتی ہے ، یکایک وہ اُس لکیر کے قریب جا کر ٹھہر جاتی ہے ۔ جس پر قدم رکھتے ہی افغانستان شروع ہو جاتا ہے اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اُس کے ہونٹ خشک ہو جاتے ہیں ، سانس تیز تیز چلنے لگتا ہے ، چہرہ پر مُردنی سی طاری ہونے لگتی ہے

جسم ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ قدم کانپنے لگتے ہیں اُسکی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگتی ہیں۔ اُسکی ماں اور ثریا قدم بڑھا کر افغانستان میں داخل ہو جاتی ہیں۔ وہ انارکلی کی یہ حالت دیکھکر اُسے اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ انارکلی کا ایک قدم آہستہ آہستہ اُٹھتا ہے اور جیسے ہی وہ قدم افغانستان کی زمین پر پڑتا ہے تو اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اُس نے دہکتے انگاروں پر رکھ دیا ہو۔ اُس کے تمام جسم میں آگ سی لگ جاتی ہے اور اس کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکل کر سرحدوں کی فضاؤں میں گونجنے لگتی ہے اور وہ بیہوش ہو کر دھڑام سے گر جاتی ہے اُسکا آدھا جسم ہندوستان میں ہوتا ہے اور آدھا افغانستان میں۔ اُسکی ماں اور ثریا اُس پر جھک جاتی ہیں۔ اُس کے پیلے بشرے پر موت کی تاریکیاں پھیل جاتی ہیں۔ ہونٹ آہستہ آہستہ کانپنے لگتے ہیں۔ اور کچھ دیر بعد اُس کے دونوں ہاتھ مُردہ ہو کر اسکی ماں اور ثریا کے ہاتھوں میں سے چھُٹ جاتے ہیں۔ اور وہ مر جاتی ہے۔

"انار......کلی"۔

"وہ دونوں چیخ مار کر رونے لگتی ہیں انکی آنکھوں سے گرم گرم اشک جاری ہو جاتے ہیں۔ اتنے میں پردے کے پیچھے سے آہستہ آہستہ گھوڑوں کی ٹاپوں

کی آوازیں آنے لگتی ہیں اور وہ آوازیں لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جاتی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کئی سوار اس طرف بڑھ رہے ہیں جب آوازیں بہت تیز ہو جاتی ہیں تو ثریا آنسوؤں سے بھری اپنی آنکھیں اٹھا کر ایک طرف دیکھتی ہے اور اس طرف اشارہ کر کے بے اختیار ماں سے کہتی ہے۔

ثریا۔ ماں۔ صاحبِ عالم۔

ماں۔ (اس طرف دیکھتے ہوئے) صاحبِ عالم۔ یہاں۔

اور دونوں بادلِ ناخواستہ تعظیم کے لئے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ سلیم کئی سپاہیوں کے ساتھ وہاں آتا ہے اور انارکلی کو زمین پر پڑی دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

سلیم۔ کیا ہوا انارکلی کو؟ آپ کیوں رو رہی ہیں؟

اور وہ جلدی سے انارکلی کے اوپر جھک جاتا ہے وہ انارکلی کے بشرے پر موت کی پرچھائیاں دیکھتا ہے اور اس کے سینہ میں ایک زلزلہ سا آجاتا ہے۔ دل دھک سے ہو جاتا ہے اور تیزی سے حرکت کرنے لگتا ہے۔ اسکی آنکھوں کے سامنے تاریکیاں چکر کاٹنے لگتی ہے وہ بے اختیار کھڑا ہو جاتا ہے اور لڑکھڑاتا ہوا انارکلی کی ماں اور ثریا کے قریب آتا ہے اور کہتا ہے۔

سلیم۔ (تھرائی ہوئی آوازیں) کیا انارکلی مر گئی۔ کیا اکبر اعظم کی تمناؤں نے موت بن کر اُسے حقیقت میں ہم سے جدا کر دیا۔

ماں۔ (ہچکیاں لیتے ہوئے) ہاں۔ صاحبِ عالم۔ انارکلی مر گئی۔

سلیم۔ (چیخکر) کیسے؟

وہ دونوں خاموش رہتی ہیں۔ وہ صرف انارکلی کی لاش کو دیکھنے لگتی ہیں۔ سلیم بھی اُسے دیکھتا ہے۔ انارکلی کا آدھا جسم ہندوستان میں ہے۔ اور آدھا افغانستان میں۔ یہ دیکھ کر سلیم کو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اُسے اپنے سوال کا جواب مل گیا ہے۔ وہ تیزی سے لڑکھڑا جاتا ہے اور فوراً زمین پر گر جاتا ہے۔ سپاہی جلدی سے آگے بڑھتے ہیں اور اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ دیر بعد وہ آہستہ آہستہ ہوش میں آجاتا ہے۔ اور پھر کھڑا ہو کر ایک سپاہی سے کہتا ہے۔

سلیم۔ (نہایت غمگین لہجے میں) مُخبر۔ تم نے ہمیں صحیح خبر دی لیکن افسوس کافی دیر بعد۔ اگر ہمیں فوراً معلوم ہو جاتا کہ انارکلی دیوار میں چنوائی نہیں گئی ہے۔ بلکہ سُرنگ کے ذریعہ باہر نکال دی گئی ہے تو ہم اسے کبھی مرنے نہیں دیتے۔

یہ کہکر وہ مردہ انارکلی کی طرف بڑھتا ہے اُس کے چہرہ اور اسکی رفتار سے اُداسی اور افسردگی ظاہر ہو رہی ہے وہ انارکلی کے قریب آکر اُسے اپنے ہاتھوں میں اُٹھا لیتا ہے۔ اور کہتا ہے

سلیم۔ اکبر اعظم نے انارکلی کے لئے جو جگہ منتخب کی تھی۔ اب یہ وہیں آرام کرے گی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

ماں: ۔ (جلدی سے) نہیں۔ نہیں۔ صاحب عالم ۔ آپ انارکلی کو لاہور نہ لے جائیے ورنہ شہنشاہ اکبر کا قہر ہم پر ٹوٹ پڑے گا۔

سلیم: ۔ انارکلی کی موت کے ساتھ ساتھ اکبر اعظم کا قہر بھی دم توڑ چکا ہے ان کی تمنا پوری ہو چکی ہے۔ جس کلی کو وہ خار سمجھتے تھے وہ مرجھا چکی ہے۔

اور یہ کہکر وہ انارکلی کو لے کر باہر نکل جاتا ہے۔ انارکلی کی ماں اور ثریا کے ساتھ ساتھ تمام سپاہی بھی سر جھکا کے چلے جاتے ہیں۔

اور پردہ گر جاتا ہے

کچھ دیر بعد گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں پردہ کے پیچھے سے آنے لگتی ہیں اور آہستہ آہستہ دم توڑ دیتی ہیں گویا سب لوگ پھر واپس لاہور چلے گئے ہیں۔

راکھ

وہ گاؤں پہاڑیوں کی وسیع گود میں آباد تھا۔ اُسکی رونق چند بے گناہ بچپنوں، چند معصوم جوانیوں اور چند بے ہوس بڑھاپوں پر منحصر تھی۔ فطرت اس پر مہربان تھی۔ اس نے زمین کی سنہری زلفوں پر ہرا ہرا دوپٹہ ڈالدیا تھا اسکی مانگ میں بیر بہوٹی کے سرخ نگ بھر دیئے تھے۔ سرسوں کے لہلہاتے کھیت، بلندی سے گرنے والے آبشار، بل کھاتی نہریں، پھلدار گھنے چمن اس کے حسن کی دلکشی کو اور نکھارتے تھے۔ اسے یہاں کی ہر شے حجاب کے گلابی رنگ میں ڈوبی نظر آتی تھی۔ سنہری سورج سرخ شعاعیں بکھیر کر پہاڑیوں کے پیچھے سے جھانکتا وہ ہرے ہرے کنجوں کی آڑ لئے مغرب میں پہونچ جاتا۔ اور پھر اپنی نورانی پیشانی پہاڑ کی سیاہ و سخت چادر میں چھپا لیتا۔ ندی چوٹی سے گرتی اور ایک نیم پوش دوشیزہ کی طرح دو کناروں سے لپٹی دُور تک خاموش چلی جاتی سرسوں کبھی پھولوں کا آنچل رخ پر ڈالے کھڑی رہتی ہر پردہ نشین شے خواہ وہ خوبصورت ہو یا بدنما آنکھیں اُس کے دیدار کے لئے بے چین رہتی ہیں اور وہ

خود چھپ کر پوشیدگی کے ظاہر ہونے کا انتظار کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ بھی منہ اندھیرے پہاڑیوں کی فرازی پر چڑھ جاتا اور وہاں سے گاؤں کی ہر چیز بے نقاب دیکھتا۔

کچھ دن بعد اُس نے یہاں کی ہر شے کو دیکھ لیا تھا۔ لیکن ایک چیز اُس کی نگاہوں سے ابتک پوشیدہ تھی وہ اس کی تلاش میں دوُر دوُر نکل جاتا۔ لیکن اُس کی متلاشی آنکھیں پیاسی رہ جاتیں اور وہ واپس آجاتا۔ کافی دن بیت گئے اُسکا تجسس بڑھتا رہا۔ آخر ایک دن اُس نے زرینہ سے پوچھ ہی لیا۔

" زرینہ۔ اگر تم مجھے اس جھیل پر نہیں لے جاتیں تو اُس کا پتہ ہی بتا دو "

" نہیں بابو۔ گاؤں والے وہ جھیل کسی کو نہیں بتاتے " زرینہ نے کہا۔ اور وہ خاموش ہوگیا۔ اُس نے دیکھا کہ زرینہ یہ جملہ کہکر اُداس ہوگئی ہے۔ اُس کا پھول سا چہرہ کمھلا گیا ہے اُس کا دل دھڑکنے لگا ہے اور اُسکی کنول جیسی آنکھوں میں خوف کے سائے ناچنے لگے ہیں اس کے بعد وہ اُس کے پاس نہ بیٹھ سکی۔ اُس نے روکا بھی لیکن وہ نہیں رُکی اور غمگین و اُداس چہرہ جھکائے گاؤں میں آگئی۔ اُس شام وہ تنہا چٹان پر بیٹھا رہا۔

اس واقعہ کے بعد زرینہ اس سے ملنے نہیں آئی۔

وہ روز چٹان پر بیٹھ کر اُس کا انتظار کرتا۔ آفتاب مغربی وادیوں کی طرف بڑھتا رہتا۔ ہوائیں چلتی رہتیں۔ کھیت لہلہاتے رہتے۔ آبشار کی

موسیقی فضا میں گونجتی رہتی۔ شام کی دلہن شفق کا غازہ ملکر دعوت دید دیتی۔ چرواہے میدانوں میں سے نکلکر گاؤں کی طرف چلے جاتے۔ لیکن زرینہ نہیں آتی۔ آفتاب غروب ہو جاتا۔ شام رات کی حدوں میں داخل ہو جاتی۔ اور وہ اداس ہو جاتا۔ اُس کے دل میں رات کی تاریکیاں سی پھیل جاتیں اور وہ تھکا تھکا سا اُٹھکر وہاں سے چلا آتا۔

زرینہ کے اس رویّہ نے اُس کے دل سے اس خوبصورت گاؤں کی رعنائی ختم کردی تھی۔ وہ ہر وقت مغموم سا رہتا۔ اداس اداس سا جیسے اُسکی کوئی انمول شے گم ہوگئی ہو۔ بکھرے بکھرے بال۔ بڑھا ہوا شیو۔ چہرے پر غم کے تاریک سائے۔ اب وہ اکثر گھر میں ہی پڑا رہتا۔ لیکن شام کو اُس چٹان پر ضرور جاتا۔ جہاں زرینہ پہلے آتی تھی۔ لیکن اب۔ وہ صرف اس چٹان کو دیکھکر کچھ دیر کے لئے اپنے آپ کو بھول سا جاتا تھا اور کھو سا جاتا تھا۔ خیالوں کی اُس حسین دنیا میں جہاں نشہ ہی نشہ ہوتا۔ سکون ہی سکون ہوتا۔ اور جسکی فضا میں وہ شراب بکھری ہوتی۔ جسمیں پونم کے چاندکی چاندنی اور قوس قزح کے رنگ گھلے ہوتے .... ایک شام وہ تنہا اس چٹان پر کھڑا دور آبشار کو گرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسکے بال ہوا میں اُڑ رہے تھے۔

"بابو۔ تم روز اِدھر اُدھر کیا دیکھتے پھرتے ہو"

جیسے فضا میں ستار کے تار جھنجھنا گئے ہوں۔ اُس نے مڑکر دیکھا زرینہ کھڑی تھی۔ اُسے دیکھکر وہ کچھ دیر کے لئے کھو سا گیا اُسے ایسا معلوم

ہوا جیسے شفق کی لالی۔ سبزے کی ہریالی۔ شبنم کی چمک۔ پھولوں کی نکہت اور گاؤں کی سادگی ایک انسانی پیکر میں ڈھل کر اُس کے سامنے آگئی ہو۔

"میں تمہارے گاؤں کو دیکھتا پھرتا ہوں" اُس نے ایک کیف میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"تم نے بڑی مسجد دیکھی بابو۔ شیوجی کا مندر دیکھا۔ ہمارے یہاں کے سیب کھائے ؟"

"نہیں"

"نہیں" ــــ وہ سراسیمگی سے بولی۔ "تو پھر تم نے کچھ نہیں دیکھا۔

"نہیں ضرور دیکھنا بابو"

"تم اپنے ساتھ لے چلو" ــــ اس نے کہا۔

"ہیں۔ اچھا چلو" ــــ اور وہ اُسے لے کر گاؤں کی فضا میں گم ہو گئی۔ دن ڈھل گیا۔ شام ہو گئی۔ وہ تصوّرات کی خوبصورت دنیا سے باہر آگیا۔ آج بھی زرینہ نہیں آئی اور وہ واپس آگیا۔

آدھی رات گذر چکی تھی۔ وہ مضمحل سا اپنے کمرے میں پڑا تھا اُس کے سامنے زرینہ رقص کرتی پھر رہی تھی۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ چونک گیا۔ اور اُس نے لیمپ روشن کر دیا۔

"زرینہ" ــــ اُس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا اور اُٹھ کر اُس کے پاس آگیا۔ زرینہ بھی ایک کلی کی طرح مرجھا گئی تھی۔ ایک شاخ کی طرح سوکھ گئی تھی۔ اُسکی بھی وہی حالت تھی جو اسکی اپنی تھی۔

"یہ تمہیں کیا ہوگیا زرینہ" ـــ اُس نے پھر کہا۔

"یہ تمہیں کیا ہوا بابو" ـــ زرینہ بولی ـــ "یہ بہت بُرا ہوا بابو۔ بہت بُرا۔ میرے ساتھ آؤ"۔

اور یہ کہکر وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ وہ بھی اُس کے ساتھ باہر آیا۔ وہ سنسان روشوں اور پگڈنڈیوں پر سے گذرتے ہوئے ایک چھوٹی سی پہاڑی کے نیچے آئے۔ رات کے بھیانک اندھیرے میں وہ پہاڑی ایک چڑیل سی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اُس کے اوپر چڑھ گئے پہاڑی کے درمیان میں ایک جھیل تھی۔ جب وہ اُس کے قریب آئے تو سیکڑوں چمگادڑ اُڑ کر فضا میں اُڑنے لگیں۔ اُن کی ڈراؤنی آوازیں ماحول کو اور بھی خوفناک بنانے لگیں۔ اس کے علاوہ دُور دُور سے جنگلی جانوروں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

"بابو۔ یہ ہے وہ جھیل" ـــ زرینہ نے کہا ـــ "جسے تم دیکھنا چاہتے تھے۔ جسمیں گاؤں کے سیکڑوں کنواری لڑکیاں ایسی ہی کالی راتوں میں ڈوب کر مرچکی ہیں۔ بابو ہمارے گاؤں میں کوئی لڑکی کسی پردیسی سے محبت نہیں کرسکتی اور نہ ہی اُس سے شادی۔ اگر گاؤں والوں کو معلوم ہوجاتا ہے کہ کوئی لڑکی کسی پردیسی سے محبت کرتی ہے تو وہ اس پردیسی کو زبردستی گاؤں سے نکال دیتے ہیں۔ اور لڑکی پر اتنے ظلم کرتے ہیں کہ وہ گھبرا کر اس جھیل میں آکر ڈوب جاتی ہے"۔

پردیسی حیرت سے اس جھیل کو دیکھ رہا تھا جسمیں سیکڑوں کنواری

لڑکیوں کے جسم تڑپ رہے تھے اور جس کی سطح پر سیکڑوں کالے کالے سائے بکھر رہے تھے اس کے دل میں زرینہ کے یہ جملے زہر بنکر اُتر گئے تھے۔ اُس نے نظر اُٹھا کر زرینہ کو دیکھا اور بولا۔

”زرینہ کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے میں اِسیوقت تم سے دُور چلا جاؤں گا۔ اپنے دیس میں جہاں سے میں تمہارے گاؤں کا حسن دیکھنے آیا تھا ——“

یہ کہکر اُس نے دونوں ہاتھوں سے زرینہ کے ملائم بازو پکڑ لیئے اور اُسے اپنے سینہ سے لگا کر اُس کے اوپر جھک گیا۔ رات کی تاریکیاں اور گہری ہو گئیں۔

دونوں نے ایک دوسرے کو آخری بار دیکھا اور جُدا ہو گئے۔ پردیسی کے دل میں ایک تیر پیوست ہو گیا۔ اُس نے اپنا بیگ اُٹھایا اور رات کی ان بھیانک ظلمتوں کو چیرتا ہوا اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ اُس کے کمزور قدم جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے۔ اُس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ یہ گاؤں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ گاؤں جہاں اُس کی محبوبہ تھی۔ جہاں دلکش مناظر تھے جہاں وہ سب کچھ تھا جو وہ چاہتا تھا۔

اور وہ لڑکھڑاتا ہوا اسٹیشن پر آ گیا۔ اتنی رات گئے یہاں کوئی موجود نہ تھا۔ وہ بے سُدھ سا ہو کر ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ لیکن وہ کمزوری کی وجہ سے زیادہ دیر نہ بیٹھ سکا اور لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا ہاتھ

کی نبض ہلکی ہونے لگی۔ اُسکی رگوں میں خون سوکھنے لگا اور اپنی اس حالت کا احساس ہوتے ہی وہ بے اختیار کھڑا ہوگیا۔ اور پھر اسٹیشن سے نکلکر گاؤں کی طرف گرتا پڑتا چل دیا۔

دھڑام۔

اور وہ زرینہ کے مکان کے دروازے پر آکر گر گیا۔ اُسکی حالت بہت زیادہ خراب ہو چکی تھی۔ کمزوری موت بن کر لمحہ بہ لمحہ اُس کے قریب آتی جا رہی تھی۔ اور اُسکی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی جا رہی تھیں۔ یکایک اُس کے ذہن میں زرینہ کے الفاظ گونجنے لگے۔

"اگر گاؤں والوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی لڑکی کسی پردیسی سے محبّت کرتی ہے تو وہ لوگ اس پر اتنے ظلم کرتے ہیں کہ وہ گھبرا کر اس جھیل میں ڈوب جاتی ہے"______

اُس نے وہاں سے اُٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ وہ وہاں سے اُٹھ نہ سکا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُسکی ٹانگوں کی جان نکل چکی ہے وہ تڑپ اُٹھا۔ اُس نے جلدی سے کانپتے ہاتھوں سے جیب سے ماچس نکالی اور ایک دیا سلائی جلاکر اپنے کپڑوں میں آگ لگالی۔ آگ آہستہ آہستہ جوان ہونے لگی۔ اور رات کی اس خاموش تاریکی میں اُس کے شعلے کافی بلند ہو گئے سارا گاؤں سوتا رہا۔ اور وہ اطمینان سے پڑا جلتا رہا۔ یہ دلسوز منظر دیکھکر رات کے سینہ میں ایک سوراخ ہوگیا۔ اور اُس میں سے آفتاب کی متراضی شعاعیں آہستہ آہستہ نمودار ہونے لگیں۔ اور صبح ہو گئی۔

زرینہ کے مکان کے سامنے سفید سفید راکھ کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ اور اُس کے اِردگِرد کچھ گاؤں والے کھڑے تھے۔

"رات کو شاید کوئی پردیسی گاؤں میں آیا ہے اور صبح ہوتے ہی کہیں چلا گیا ہے ۔۔۔" ایک نے کہا۔

"ہاں۔ ہاں، سردی بھی تو بہت پڑ رہی ہے ۔۔۔" کسی نے کہا۔

اور پھر سب چلے گئے۔ اس کے بعد حزن و یاس میں ڈوبی زرینہ گھر سے باہر آئی اور جھاڑو سے اس راکھ کے ڈھیر کو راستہ میں سے صاف کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد راکھ کا غبار اس زور سے اُٹھا کہ وہ اُس کے اندر گم ہو گئی اور چاروں طرف راکھ ہی راکھ پھیل گئی۔

سُنہری کلیاں

آج سے بہت دن پہلے ....

جب وہ شہر جا رہا تھا۔ موہینہ نے کہا تھا ـــــ "میں تمہارا انتظار کروں گی جلد آنا" ـــــ یہ سنکر وہ اُداس ہو گیا تھا اور اُس نے بے اختیار کہا تھا ـــــ "موہینہ مجھے معلوم نہ تھا کہ تعلیم مجھے تم سے جُدا کر دے گی۔ اگر میں ہائی اسکول نہ ہوتا تو کبھی نوکری کے لئے شہر نہ جاتا۔ کبھی تم سے جُدا نہ ہوتا۔ کبھی گاؤں سے دُور نہ جاتا۔ یہیں پر محنت مزدوری کرتا" ـــــ یہ سنکر موہینہ نے اس کے ہونٹوں پر اپنا گورا گورا ہاتھ رکھ دیا تھا اور کہا تھا ـــــ "ایسا نہ کہو۔ گاؤں میں سب سے زیادہ تم ہی نے تو پڑھا ہے۔ سب کہتے ہیں کہ تم شہر جا کر بابو بن جاؤ گے۔ ایسے بابو جسکی عزت سب لوگ کرتے ہیں۔ اور وہ بابو اپنے گاؤں والوں کے سب کام ذرا سے اشارہ میں ٹھیک کرا دیتا ہے" ـــــ

موہینہ کی اس بات کا خیال آتے ہی وہ مُسکرا دیا۔ ٹرین اور تیز ہو گئی۔

کیونکہ شہر جاکر وہ بابو نہیں بنا تھا۔ بلکہ ایک کلاتھ مِل کا مزدور بن گیا تھا۔ اُس نے پہلے نوکری کے لئے بہت کوشش کی۔ ایمپلائمنٹ میں اپنا اندراج بھی کرایا لیکن شہر میں ہائی اسکول کی کوئی قدر نہ تھی۔ اسلئے اُسے کہیں بھی نوکری نہ ملی وہ انسردہ ہو گیا۔ مجبوراً اُس نے رکشا چلانا سیکھ لیا اور پھر وہ رکشا چلانے لگا۔ لیکن اُس نے یہ راز گاؤں والوں پر عیاں نہ ہونے دیا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اگر وہ اپنی موجودہ حالت خط میں لکھدے تو تمام گاؤں والے کبھی اپنے بچوں کو تعلیم نہ دلائیں گے۔ بلکہ تعلیم کا یہ انجام دیکھکر وہ بچوں کو اسکول سے ہٹالیں گے۔ اس کے بعد رکشا چلاتے چلاتے جب اس کا دم پھولنے لگا۔ اور اسکی آنتیں کمزور ہوگئیں تو اس نے کوئی ہلکا کام کرنے کا ارادہ کیا۔ اُسے حسب منشا کام تو نہ ملا۔ البتہ ایک کلاتھ مِل میں ٹوٹے ڈورے جوڑنے کی مزدوری مِل گئی۔ اور وہ مزدور بن گیا۔ ہائی اسکول پاس مزدور۔ وہ شب و روز کی محنت سے بہت نحیف و کمزور ہوگیا تھا۔ جب کبھی آئینہ میں وہ اپنے سیاہ و سفید اُلجھے ہوئے بال۔ پیلا اور پچکا ہوا چہرہ اور لاغر جسم دیکھتا تو عہد کرتا کہ اب وہ کبھی گاؤں واپس نہیں جائے گا۔ اس کی یہ حالت دیکھکر گاؤں والے کیا کہیں گے اور وہ کیا جواب دے گا ؟ ؟ ؟ ....

اپنے اس عہد کے باوجود آج وہ گاؤں واپس جارہا تھا۔ ٹرین متواتر رات کا سینہ چیرتی آگے بڑھ رہی تھی۔ اور وہ آنے والی صبح کے انتظار میں خاموش ایک برتھ پر بیٹھا تھا۔

صبح ہوگئی۔ ٹرین ایک ویران سے اسٹیشن پر آکر ٹھہر گئی وہ ایک دم کھڑا

ہو گیا۔ اور جلدی سے نیچے اتر آیا۔ وہی اسٹیشن ہے وہی فضا ہے۔ سامنے وہی آم کا گھنا باغ ہے۔ وہی گاؤں ہے۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا اور اسکا دل ایک انجانی خوشی سے جھوم اٹھا۔ اتنی مدت کے بعد آج اس نے سکون محسوس کیا تھا۔ اور اتنے سال بعد آج اس نے نیلے اور کھلے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ اسٹیشن سے باہر آیا۔ اور کچی پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف کپاس کھڑی تھی اور اس کے سفید سفید بال سیم پوش دوشیزاؤں کی طرح انگڑائیاں لے رہے تھے ہاں۔ انھیں پودوں کے درمیان وہ اور موہنیہ بیٹھے پہروں باتیں کرتے رہتے تھے میٹھی میٹھی اور کبھی نہ ختم ہونے والی باتیں ——— اور اوپر نیلا آسمان جھک آتا تھا۔ رنگ برنگ کے پنچھی ایک غول بناکر فضا میں بہار کے گیت گاتے پھرتے تھے۔ ہوائیں جھومنے لگتی تھیں۔ کھیت وجد کرنے لگتے تھے اور ان دونوں کی آنکھیں بوجھل سی ہو کر جھکنے لگتی تھیں۔ ہونٹ پھڑکنے لگتے تھے اور وہ موہنیہ کا گداز جسم اپنی آغوش میں لے لیتا تھا اور اس کے سرخ رخساروں پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا تھا۔ کتنا کیف تھا۔ کتنا سرور تھا۔ کس قدر بیخودی تھی۔ اس آنچ میں جو موہنیہ کے رخساروں میں دہکتی تھی وہ ڈوب سا گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ پگڈنڈی پر نہیں بلکہ کسی مست خرام بادل کے ٹکڑے پر کھڑا فضا میں اڑا چلا جا رہا ہے۔ چاروں طرف نشہ ہی نشہ پھیلا ہے اور گاؤں کی خوبصورت دوشیزائیں ملہار گاتی پھر رہی ہیں۔ اور انکی میٹھی میٹھی آوازیں آسمانوں میں گونج رہی ہیں۔

کپاس کے کھیت گذر گئے اب وہ ایکھ کے کھیتوں کے درمیان جا رہا تھا۔ اس کے دونوں طرف میٹھے میٹھے رس بھرے گنے کھڑے تھے وہ ہوائیں اس طرح

جھوم رہے تھے۔ گویا اس کے خیر مقدم کے لئے جھکے جا رہے ہوں۔ ان کھیتوں میں سے وہ اور موتبینہ شام کے وقت گنے توڑتے تھے اور کھاتے ہوئے گھر کی طرف چلے جاتے تھے۔ آفتاب اُن کے سامنے شفق میں ڈوب رہا ہوتا تھا اور دور سے یہ ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے شفق کے کنارے دو سائے متحرک ہوں۔

ایکھ کے کھیت بھی گذر گئے، سامنے گاؤں کا تالاب تھا جس کے کنارے پیپل کے اونچے اونچے درخت کھڑے تھے اور جنکی چھایہ میں بیٹھکر یہ دونوں تالاب کے ان گول گول دائروں کو دیکھتے تھے، جو اس کی اینٹ سے سطح آب پر رقص کرنے لگتے تھے وہ اس تالاب کو بھی دیکھتا ہوا گذر گیا، سامنے گاؤں آگیا تھا۔ کئی کسان کندھوں پر ہل رکھے اسطرف آرہے تھے ان کے آگے بیل جھومتے ہوئے چل رہے تھے۔ اس نے دیکھا وہ سب کو جانتا تھا اور وہ اُسے جانتے تھے لیکن جب وہ اُن کے قریب پہونچا تو وہ ایک اُچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے کھیتوں کی طرف بڑھ گئے۔ وہ حیران رہ گیا اُسکی آواز بھی نہ نکلی کیا وہ اتنا بدل گیا کہ وہ اسے پہچان بھی نہ سکے۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ آگے بڑھا۔ بہت سی عورتیں سروں پر مٹکیاں رکھے کنوئیں کی طرف جا رہی تھیں۔ لیکن وہ بھی اُسے دیکھتی ہوئی نکل گئیں۔ اُس کا سر گھومنے لگا۔ اور وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ تنہا موتبینہ آرہی تھی۔ اُسکے سر پر ایک کپڑے میں بندھی روٹی رکھی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُسکی موتبینہ آرہی تھی، وہی سڈول اور گورا گورا جسم بھرے بھرے بازو۔ گول گول چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں اور آنکھوں میں چوڑا چوڑا کاجل۔ لال رنگ کا لہنگا اور ہلکے نیلے رنگ کی کرتی اور پیلا دوپٹہ

وہ شباب اور جوانی کے نشہ میں مست چلی آرہی تھی۔ وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور آواز دی۔

"موہنیہ"

وہ رک گئی۔ اور سراسیمگی سے اُسے دیکھنے لگی۔

"موہنیہ۔ میں شہر سے آگیا" ——— اُس نے آگے بڑھتے ہوئے پھر کہا۔

"بابا۔ میرا نام حسینہ ہے۔ کیا تم میری ماں کو پوچھ رہے ہو"؟؟؟

"حسینہ" ———

اور اس کے ذہن پر ایک زوردار چوٹ لگی اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے مل کی کوئی آہنی مشین اس پر آگری ہو۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے ہی والا تھا کہ خود بخود سنبھل گیا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"تمہارا نام حسینہ ہے"

"ہاں بابا ——— میری ماں کا نام موہنیہ ہے"۔ لڑکی نے جلدی سے کہا۔

اُس کے دل میں ایک طوفان اُمنڈ آیا۔ برق چمکی اور اُسکی اُمیدوں کی سنہری کلیاں جھلس گئیں۔ وہ آگے بڑھا اور بے اختیار اُس نے اس لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور ایک شفیق باپ کی طرح اُسے پیار کرکے پھر واپس سٹیشن کی طرف چلا گیا۔

رات کے بارہ ۱۲ بج چکے تھے۔

وہ اپنے کمرے میں اُداس بیٹھا تھا اُس کے سامنے رکھی میز پر کچھ سفید اور
سادہ کاغذ بکھرے تھے۔ آج وہ ایک کہانی تخلیق کرنا چاہتا تھا۔ ایک حسین
افسانہ۔ اپنے سماج کے لئے۔ اپنی سوسائٹی کے لئے اور اپنے بھوکے پیٹ کے لئے۔
کیونکہ وہ ایک غریب افسانہ نگار تھا لیکن نا معلوم آج اُس کا قلم کیوں نہیں چل
رہا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کا ذہن خالی ہے۔ بالکل کورا اُس
کے سامنے بکھرے سفید اور سادہ کاغذوں کی طرح —— اُس نے بہت کوشش
کی۔ لیکن اُس کے ذہن میں کوئی پلاٹ نہیں اُبھرا۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پیتا رہا
لیکن اُسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اور تھوڑی دیر بعد اُس نے کاغذ پر جو لکھا تھا وہ بھی کاٹ
دیا۔ اور اپنے سامنے جلتے ہوئے چراغ کی تھرتھراتی لو کو دیکھنے لگا۔ اُسے ایسا
معلوم ہوا جیسے چراغ اُسکی طرف دیکھکر مسکرا رہا ہو۔ ایک عزیز دوست کی طرح۔ ایک
سچے رفیق کی طرح۔ کیونکہ وہ بھی زندگی بھر اس چراغ کے مانند جلا تھا اس نے بھی اپنی

دل جلایا تھا۔ اپنا لہو جلایا تھا، اپنا جسم جلایا تھا۔ اپنی تمنائیں اور آرزوئیں جلائی تھیں۔ بالکل اس چراغ کی طرح۔ اس دیپک کی طرح وہ خود جلا تھا۔ اور اپنی کہانیوں کے ذریعہ سماج کو نئی روشنی دی تھی۔ دنیا پرکاش دیا تھا۔ نئی منزل دکھائی تھی اور نئے راستے روشن کئے تھے لیکن اُسے اس زبردست قربانی کا صلہ کیا ملا۔؟ — صرف غریبی۔ بھوک، فاقے، بیماری، دُکھ اور تکلیف — اس کے باوجود وہ خاموش تھا۔ بالکل اس بے زبان چراغ کے مانند جسے وہ گھور رہا تھا وہ گھورتا رہا اور بہت دیر تک گھورتا رہا۔ — اور کچھ دیر بعد چراغ کا تیل ختم ہو گیا اور وہ آہستہ آہستہ بجھ گیا۔ کمرے میں چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا۔ اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا گویا دیپک کے ساتھ وہ بھی بجھ گیا ہو اور اسمیں سفید سفید دھواں اُٹھ رہا ہو۔ اُس نے جلدی سے تیل کی بوتل اُٹھائی۔ لیکن آج اُسمیں بھی تیل نہیں تھا وہ بھی خالی تھی۔ اُسکے ذہن کی طرح معًا وہ گھبرا گیا۔ اور کھڑا ہو کر کمرے میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا لیکن چاروں طرف ظلمت ہی ظلمت تھی دفعتاً سے ایسا معلوم ہوا گویا کمرے کی دیواریں دھیرے دھیرے سمٹ رہی ہوں ——— اور وہ کمرے کی اسں گھٹن سے گھبرا گیا اور اپنی کھلی اور چورس چھت پر آ گیا اور ایک دیوار کے سہارے کھڑا ہو کر اپنی غمناک نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا ———

دُور دُور تک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اور سارا سنسار نیند کی گداز گود میں پڑا سو رہا تھا۔ چاروں طرف ہلکی ہلکی چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور آکاش کے نیل میں چاندنی کی ناؤ دھیرے دھیرے تیر رہی تھی۔ اور اس کے ارد گرد تارے اسطرح چمک رہے تھے جیسے کسی تالاب میں بہت سے کنول مہک رہے ہوں اچانک اُسے اس نورانی فضا میں گھنگروؤں کی مدھر جھنکار سنائی دی — دُور — بہت دور

——— جیسے کوئی جلترنگ بجا رہا ہو۔ اور گھنگروؤں کی مدھر جھنکار کے ساتھ ہی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے سرسرانے لگے ——— اور ہر سو سرخ شراب سی بکھیل گئی ——— اور چاند کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ وہ ایک دم چونک سا گیا۔ اور اوپر تاروں بھرے آکاش میں دیکھنے لگا ——— آسمان کے ایک گوشہ میں چاندی کا دمکتا ہوا ایک دروازہ وا تھا۔ اور اس میں سے ایک خوبصورت اور حسین دوشیزہ مسکراتی ہوئی باہر نکل رہی تھی۔ اس کے گورے گورے اور کومل پاؤں میں پائل چھن چھن چھنک رہی تھی۔ اس کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھل رہا تھا۔ اسکے باریک لباس میں سے اُجلا اُجلا بدن جھلک رہا تھا اس کے بال ساون کی رات کیطرح کالے تھے اور انمیں افشاں ہیروں کی طرح جگمگا رہی تھی۔ اسکے رس بھرے ہونٹ رنگین دھنک کی طرح مسکرا رہے تھے اُسکی آنکھیں کیف و سرور کی روشنی سے جھلملا رہی تھیں۔ اس کے نرم نرم پیوٹے سبز رنگ میں رنگے ہوئے تھے ——— وہ ایک حسین دیو داسی کی طرح رقص کرتی ہوئی چاند کی کشتی کے قریب آئی اور اسمیں بیٹھ گئی چاند ہولے ہولے آکاش میں تیرنے لگا ——— اور تھوڑی دیر بعد وہ اسکی چھت پر اُتر آیا۔ چاروں طرف اُجالا پھیل گیا۔ ٹھنڈا اور اُجلا اُجلا اُجالا ——— دوشیزہ نہایت سبک انداز سے چاند میں سے اُتری اور اپنا آنچل ہوا میں لہراتی ہوئی اسکے پاس آئی اور سامنے کھڑی ہو کر مسکرانے لگی۔

"تم کون ہو؟" وہ اُسے سراسیمگی سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"جسے تم فراموش کر چکے ہو۔ میں وہی ہوں۔ آج تمہیں رنجور دیکھکر مجھ سے رہا نہ گیا۔ اور بس آگئی۔ تم اتنے اُداس کیوں ہو؟" ——— اس نے پوچھا۔

یہ سنکر اُس نے اُسکی مست آنکھوں میں جھانکا اور پھر جواب دیا۔

"مجھے میری زندگی نے اداس کر دیا ہے۔ نا اُمید کر دیا ہے ...... لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"مجھے تم سے ...... مجھے تم سے" اور اُسکی آنکھیں حیا سے جھک گئیں۔

"اگر تمہیں مجھ سے پیار ہے تو مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ اس دُنیا سے دُور اپنے دیس میں۔ تاروں کے دیس میں۔ اُفق کے اُس پار۔ جہاں تم رہتی ہو۔ جہاں کوئی غم نہیں ہے"

"تم یہ کیسی باتیں کرنے لگے" دوشیزہ نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا "تم غم سے گھبرا کر یہ دنیا چھوڑ دینا چاہتے ہو۔ یہ دُنیا جسے تمہاری ضرورت ہے تمہارے فن کی ضرورت ہے تم غم سے گھبراتے ہو غم ہر جگہ موجود ہے یہاں بھی۔ اور تاروں کے دیس میں بھی —— کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کبھی تاروں کے چہرے بھی اُترے اُترے نظر آتے ہیں اور وہ پھیکے پھیکے ٹمٹماتے ہیں اور اُنکے آنسو تمام رات شبنم بنکر زمین پر گرتے رہتے ہیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کبھی کبھی ہواؤں کے سانس بھی رُک جاتے ہیں اور وہ غمگین واُداس کسی کونے میں بیٹھ جاتی ہیں اور پہروں روتی رہتی ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کبھی کبھی آسمان بھی اُجڑا اُجڑا نظر آتا ہے۔ ایک جوان بیوہ کی طرح۔ کیا تم نے کبھی چاند اور سورج کو گہناتے ہوئے نہیں دیکھا۔ تم یہ نہ سمجھو ادیب کہ تم ہی اُداس ہو۔ بلکہ غم ہر شے کو اُٹھانا پڑتا ہے —— ہر شے کو —— اور یہ غم زندگی کے ساتھ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ جس دن زندگی مر جائے گی۔ اُس دن غم بھی مر جائے گا۔ اسلئے ہنسو اور خوب ہنسو ادیب۔ خوب ہنسو"

وہ خاموش ہو گئی۔

لیکن ادیب نے بے اختیار اسکی گول گول باہیں پکڑ لیں۔ اور آہستہ سے بولا۔

"مجھے یہاں سے اپنے ساتھ لے چلو۔ میرا دل اس دنیا میں نہیں لگتا۔ میں یہاں ہنسنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن میرے لب مسکرانے سے پہلے سوکھ جاتے ہیں۔ میری آنکھیں خوشی سے جگمگانا چاہتی ہیں۔ لیکن وہ جگمگانے سے پہلے تاریک ہو جاتی ہیں۔ میں یہاں دوسروں کے لئے سلگتا ہوں۔ لیکن دوسرے مجھ پر قہقہے لگاتے ہیں۔ مجھ پر ہنستے ہیں۔ اور میری زبوں حالی سے نفرت کرتے ہیں۔ یہی ہے نا میرے جلنے کا صلہ۔ یہی ہے نا میرے مٹنے کا حاصل۔ یہی ہے نا میرے فاقوں کا انعام ـــ میرے ساتھی۔ آج میرا قلم بھی رک گیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے۔ میرا ذہن بھی خالی ہو گیا۔ میری ضیا بھی تاریک غاروں میں اتر گئی۔ اب میں بے کار ہوں۔ بالکل بے کار دھرتی کے سینہ پر ایک بار۔ ایک بوجھ۔ ایک وزن۔ اب مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ اپنے دیس میں۔ تاروں کے دیش میں۔ جہاں مجھے میری کاوشوں کا صلہ مل سکے۔"

"تم نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ تمہیں تمہاری کاوشوں کا صلہ نہیں ملا اور تمہارا جلنا بے سود رہا۔" وہ اس کے اور قریب آ گئی۔" اور تمہیں اس کے عوض کچھ نہیں ملا۔ ـ ادیب، تمہارے جلنے نے تمہیں امرت پلا دیا ہے اور اب تم کبھی نہیں مر سکتے۔ کبھی نہیں۔ اور ہمیشہ زندہ رہو گے۔ اپنی امر کہانیوں کے ساتھ اپنی ان تخلیقوں کے ساتھ جو تمہارے خون میں رنگی ہوئی ہیں۔ تمہارا نام ہمیشہ دنیا کی فضاؤں میں گونجتا رہے گا۔ تم امر ہو۔ امر۔ اور یہ دوامیت اسی کو نصیب

ہوتی ہے جو خود کو جلاتا ہے، خود کو مٹاتا ہے۔ خود کو قربان کرتا ہے ایک چراغ کی طرح۔ ایک شمع کی طرح ــــــ"

اور یہ کہہ کر دوشیزہ نے اپنی گداز باہیں اُس کے گرم ہاتھوں میں سے چھڑا لیں۔ اور اپنی چاندنی کی ناؤ میں جاکر بیٹھ گئی۔ ادیب کے ذہن میں سینکڑوں کنول کھل گئے۔ ناامیدی کی تاریکیاں چھٹ گئیں، اور اس کا اُداس دل ایک انجانی خوشی سے جھوم اُٹھا۔ وہ آگے بڑھا اور بولا۔

"تم جا رہی ہو؟"

"ہاں"

"کل بھی آؤ گی نا۔ مجھے زندہ رکھنے کے لئے، میرے فن کو زندہ رکھنے کے لئے"

"ہاں۔ جب کبھی ایسی رات آئے گی۔ میں ضرور تمہارے پاس آؤنگی۔ تم میرا انتظار کرنا۔ میں ضرور آؤنگی۔ ضرور"

اور وہ خاموش ہوگئی۔ چاندنی کی ناؤ فضا میں دھیرے دھیرے تیرتی ہوئی مغرب کی طرف چلی گئی اور اُس کے دیکھتے دیکھتے بادلوں کی اوٹ میں چھپ گئی۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا، لیکن اُس کے کانوں میں بہت سی میٹھی میٹھی گھنٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اُس نے مڑ کر پورب کی طرف دیکھا۔ پورب کے سرے گلابی ہو چکے تھے اور سنہری آفتاب کا خوبصورت سفینہ ہولے ہولے اُبھر رہا تھا۔ وہ نیچے اُتر آیا اور اپنے کمرے میں

آگر سورج کی پہلی کرن کی روشنی میں ایک کاغذ پر جلی حرفوں میں اُمید لکھ دیا جو اسکی نئی کہانی کا عنوان تھا۔

اور اب اُس کا قلم تیزی سے کاغذ پر دوڑ رہا تھا۔
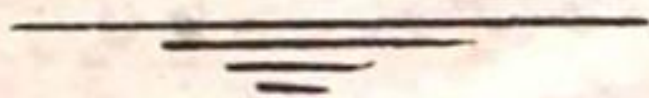
فردوس پبلشنگ ہاؤس
کی اگلی پیشکش
چھینٹے

آپکے جانے پہچانے فنکار اسرار اکبرآبادی بی۔ اے کے قلم کا ایک اور کرشمہ جو اس مرتبہ آپکو قہقہوں کی وادیوں کے درمیان لے جائیگا۔ چھینٹے افسانے کیساتھ منظر عام پر آرہا ہے۔ جلد آرڈر دیجئے۔ قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے ۔ جس کے متعلق کچھ اہل قلم حضرات یہ فرماتے ہیں :۔

میکش اکبرآبادی ۔ اسرار اکبرآبادی بی۔ اے ان نوجوان ادیبوں میں ہیں جنہوں نے روایتی شاعری کے حدود سے آگے بڑھ کر نثر کو بھی اپنی ادبی بصیرت اور فنی صلاحیت کا آئینہ دار بنانا پسند کیا ہے۔
ان کے طنز و ظرافت میں اصلاح و ہمدردی کا جذبہ پوری طرح کارفرما ہے۔ خدا کرے وہ مستقل مزاجی سے ادب اور انسانیت کی خدمت کرتے رہیں اور آگرے کی علمی و ادبی روایات کو لے کر آگے بڑھتے رہیں۔

ابر احسنی گنوری ۔ اسرار اکبرآبادی بی۔ اے کے "چھینٹے" اپنے دامن میں اگر ایک طرف ہنسی اور قہقہوں کا طوفان لئے ہیں تو دوسری طرف ان کے اندر معلوماتی اور اصلاحی خصوصیات بھی موجود ہیں۔ ان کے علاوہ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی ٹیکنک بالکل مختصر افسانے کی سی ہے اسلئے اگر انہیں اسرار اکبرآبادی کے

مزاحیہ افسانے کہا جائے تو بیجا نہیں ان کے دلنشیں اندازِ بیان اور گہرے طنز نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔

پروفیسر مغیث الدین فریدی ایم اے - اسرار اکبرآبادی بی۔ اے آگرہ کے نوجوان ادیب اور شاعر ہیں نثر اور نظم دونوں پر قدرت رکھتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے جس صنفِ ادب پر قلم اٹھایا اس کے مطالبات کو پورا کرنے کے لئے محنت اور تبحر کا حق ادا کر دیا ہے طنز و مزاح کی وادی ادب کی بڑی دشوار گزار منزل ہے یہاں اچھے اچھوں کو بہکتے اور بھٹکتے دیکھا گیا ہے اس منزل کو اسرار اکبرآبادی نے بڑی خوش اسلوبی سے طے کیا ہے مقامی اخبارات میں "بنر بری کی ڈائری" اور "بھنڈے" کے عنوان سے جو طنزیہ مضامین شائع ہوئے ہیں، وہ اسرار اکبرآبادی کی فنی صلاحیتوں کے آئینہ دار ہیں۔ ان مضامین کا خام مواد آگرہ کی ادبی اور سماجی زندگی سے لیا گیا ہے، لکھنے والے نے اپنے مشاہدات اور محسوسات کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے یہی ان مضامین کے پُراثر ہونے کا سبب ہے نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ ادب اور سماج کی ناہمواریاں پیش کی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ طنز میں تلخی اور جھلاہٹ نہیں ملتی۔ آسودگی اور شگفتگی کی فضا ان نشتروں کو گوارا بنائے ہوئے ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ "بھنڈے" اسرار اکبرآبادی کی ادبی زندگی کا ایک اور نقش بن کر دنیائے ادب میں نشانِ راہ کا درجہ حاصل کریں گے۔

(سردار صاحب) ماسٹر جگت سنگھ (ایڈیٹر "بنائے تعلیم دہلی") ہمارے دوست جناب اسرار اکبرآبادی بھی کیا خوب مردِ خدا ہیں۔ انہیں دو کروں پر "بھنڈے" ڈالنے کی کافی عادت ہے مگر وہ بھنڈے کیچڑ یا کسی اور دوسری چیز کے نہیں ہوتے بلکہ عالمانہ طریق پر اس طرح ڈالتے ہیں کہ مخاطب صاحب ان سے ایک گونہ درس اور عبرت انگیز سبق حاصل کرتے ہیں یعنی ان کا لکھا ہوا "ٹال مٹول" پڑھا۔ جس میں کتوں کے اوصاف پر خامہ فرسائی کی گئی ہے وہ فرماتے ہیں .... بس میری چاہ ہے کہ جو صاحب ان بھنڈوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں وہ ضرور ان کا مطالعہ کریں۔